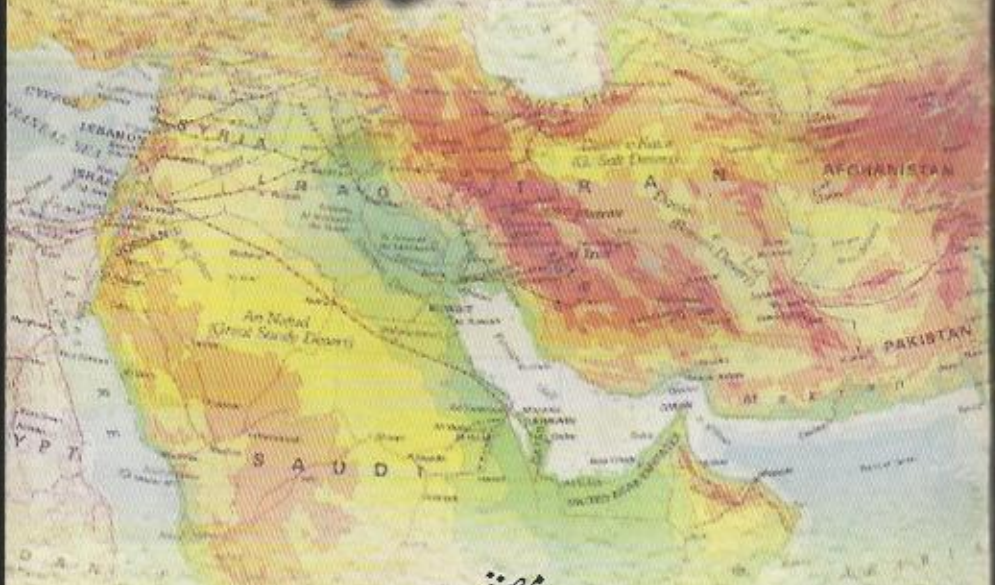


# اسلامی ریاست کا تصور



مصنف

پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون مرحوم ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی۔ (کیمرج۔ برطانیہ)

مترجم

غلام مرتضیٰ سعیدی

ناشر

رضا اکیڈمی انٹرنیشنل اسٹاکپورٹ (برطانیہ)





## رضا اکیڈمی پبلی کیشنز 2006ء

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں۔ پبلشر کی منظوری کے بغیر یہ کتاب یا اس کا کوئی بھی جزو کسی بھی طور پر اصل یا ترجمہ کی شکل میں یا ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کیا جاسکتا ہے نہ ہی الیکٹرانک ہیکنکل یا زیروکس وغیرہ کے ذریعہ اسے منظر عام پر لایا جاسکتا ہے۔

نام کتاب: اسلام کا تصویر ریاست

مصنف: ڈاکٹر محمد ہارون (مرحوم) ایم، اے۔ پی ایچ، ڈی (کیمبرج، برطانیہ)

مترجم: غلام مرتضیٰ سعیدی لاہور (پاکستان)

مرتب: ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی بریلی شریف (بھارت)

کمپوزنگ: عتیق احمد شمتی عرف شجاع ملک

RAZA ACADEMY (INTERNATIONAL)

138 Northgate Road, Edgeley, Stockport  
SK3 9NL (England).

Phone: 0161-4771595,

Phone/Fax: 0161-2911390

E-mail: islamictimes@aol.com

Distributor in India

(2) Dr. A. Naim Azizi. 104, Jasoli, Bareilly,  
U.P. India

Distributor in Pakistan

Jamia Nizamia Razvia inside Loharigate  
Lahore (Pak)

## روحانی سرپرستی اور تہمت کی گھنی چھاؤں

زیر نظر کتاب اسلام اور سائنس کے حدود (اردو ترجمہ)

☆ شہزادہ اعلیٰ حضرت حضرت مفتی اعظم ہند مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خاں  
صاحب نوری، بریلوی

☆ بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور حضرت حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب  
رحمۃ اللہ علیہما کے فیضان کرم اور روحانی سرپرستی ————— نیز

☆ پیر طریقت حضرت مولانا سبحان رضا خاں سبحانی میاں سجادہ نشین  
آستانہ عالیہ رضویہ بریلی شریف

☆ حضرت مفتی سید ابوالکمال صاحب قادری نوشاہی

☆ ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب

☆ حضرت مفتی عبدالمصطفیٰ ابن حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب ہزاروی

☆ ڈاکٹر خضر حیات صاحب نوشاہی ☆ محمد افضل حبیب

☆ چوہدری محمد صابر ☆ الحاج صابر حسین ☆ جناب محمد صادق صاحبان

کی حمایت اور دعاؤں کی گھنی چھاؤں میں منظر عام پر آسکی۔

الحاج محمد الیاس قادری

بانی و چیئرمین رضا اکیڈمی

اسٹاکپورٹ (برطانیہ)



## پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون

### ایک تعارف

الحاج محمد الیاس کشمیری

بانی و چیئر مین رضا اکیڈمی، برطانیہ

آج دنیائے مغرب میں جس طرح حکومت کی سرپرستی اور پیپر والیکٹر انک میڈیا کے ذریعہ اسلام خالف پروپیگنڈہ ہو رہا ہے اور مسلمانوں کی جس طرح کردار کشی کی جا رہی ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ عام لوگوں کا رجحان اسلام دشمنی ہوتا مگر ان کے پروپیگنڈے کی شدت کے ساتھ عام آدمی اسلام کی طرف راغب ہو رہا ہے اور دن بدن اسلام کی ترویج و ترقی میں تیزی آرہی ہے۔ لاریب یہ فضل ربی ہے!

اس وقت صرف برطانیہ میں 40 لاکھ سے اوپر مسلمان رہتے ہیں جن میں لگ بھگ 50,000 مسلمان انگریز نو مسلم ہیں اور یہاں 7000 سے زیادہ مساجد ہیں۔ نو مسلم انگریزوں میں ہر طبقہ خیال کے لوگ شامل ہیں۔ امیر و غریب، عام پڑھے لکھے و اعلیٰ تعلیم یافتہ، ڈاکٹرز، پروفیسرز، ماہرین تعلیم، سیاستدان، دانش ور اور محقق سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں۔ ان دانش وروں اور محققین میں عزت مآب پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ ہے جسے جاننے کے لئے ان کی کتاب "Why I accepted Islam?" (یعنی میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟) کا مطالعہ ضروری ہے۔

انہوں نے 1988ء میں اسلام قبول کیا اور اس کتاب میں اپنے قبول کرنے کی وجوہات بیان کی ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہارون جیسے دانش ور اور عبقری کا دائرہ اسلام میں آنا حقانیت اسلام کے ایک زندہ معجزے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مجھ سے زیادہ قریب انہیں شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ ان سے اسلام، اہل سنت اور مجدد اسلام امام احمد رضا قدس سرہ پر جو کام اس احقر نے کرایا، اگر وہ اس سے نہ ملتے تو یہ علمی و تحقیقی اور تبلیغی کام شاید کبھی نہ کر سکتے۔ میری ان سے پہلی ملاقات ان کے قبول اسلام کے ایک سال بعد ہوئی۔ اس وقت شیطان رشدی نے اپنی ناپاک کتاب لکھی تھی۔ راقم نے اس کتاب کے رد میں ایک کتاب لکھی جو اس قدر مقبول ہوئی کہ دو ماہ میں اسکے دواڈیشن شائع کرنے پڑے۔ ڈاکٹر محمد ہارون صاحب نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مجھ کو لکھا کہ اگر آپ کو کسی قسم کے تعاون کی ضرورت ہو تو مجھ سے رابطہ کریں۔

ایک دن راقم کو پروفیسر آصف حسین صاحب ڈاکٹر ہارون صاحب کے گھر لے گئے۔ راقم کو دعوت تو نہیں تھی لہذا آصف صاحب کو چھوڑ کر راقم نیچے کار میں بیٹھا رہا۔ جب ڈاکٹر محمد ہارون صاحب کو میری بابت معلوم ہوا تو باہر آ کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے میری قائم کردہ ”رضا اکیڈمی“ اور انگریزی ماہنامہ ”دی اسلامک ٹائمز“ کے بارے میں گفتگو کی اور بتایا کہ وہ یہ ماہنامہ پڑھتے ہیں اور اسے انہوں نے بہت مفید پایا۔ میں نے ان سے اس میں لکھنے کی فرمائش کی جسے انہوں نے قبول کیا۔ میں نے ان سے اسلام پر لکھی گئی انکی تحریریں بھی عنایت فرمانے کی گزارش کی۔

ایک ماہ کے بعد میں نے پروفیسر صاحب کو اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ وہ وقت پر تشریف لائے اور کھانے کے بعد مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال رہا۔ میں نے ان کو اسلام اور اہلسنت کے لئے امام احمد رضا کی تحریکات اور پیش



قیمت علمی خدمات کے بارے میں بتایا تو وہ یہ سن کر حیرت زدہ ہو گئے اور افسوس کرنے لگے کہ آخر انہوں نے امام احمد رضا کو کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے رضا اکیڈمی برطانیہ سے شائع کئے گئے امام احمد رضا کے ”ترجمہ قرآن“، ”سلام رضا“ کا منظوم ترجمہ اور ”الدولۃ المملکیۃ“ انہیں انگریزی میں دئے۔

میری ہی فرمائش پر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب نے اپنے قبول اسلام کی بابت کتاب "Why i accepted Islam?" لکھی جسے رضا اکیڈمی نے شائع کی۔ کتاب مسلمانوں کے ہر طبقہ اور نو مسلموں میں بھی بہت مقبول ہوئی اور کتنے انگریز اس کتاب کو پڑھ کر کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکل کر اسلام کے نوری دائرہ میں داخل ہو گئے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

محترم غلام مرتضیٰ سعیدی سابق صدر انجمن طلبہ اسلام پاکستان (A-T-I) نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا جسے راقم نے شائع کیا اور یہ بریلی شریف (بھارت) سے بھی شائع ہوئی۔ عصر حاضر میں یہ کتاب اسلام کا سب سے عمدہ اور علمی تعارف ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں جن موضوعات کو اپنے اسلام قبول کرنے کے لئے زیر قلم کیا وہ یہ ہیں۔

- (۱) تعارف (۲) ذاتی وجوہات (۳) سیاسی وجوہات (۴) دانشورانہ وجوہات (۵) اسلام ہمیشہ رہے گا (۶) اخلاقی وجوہات (۷) اسلام کی حقانیت (۸) نتیجہ۔

جب کوئی جدید ذہن ان عنوانات ہی کو ایک نظر دیکھتا ہے تو وہ دنگ رہ جاتا ہے اور عرشِ عشق کہہ اٹھتا ہے کہ اس انسان کے پاس کوئی خاص انعام خداوندی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا اور یادداشت بلا کی تھی۔ وہ 600 صفحات کی کتاب ایک گھنٹہ میں پڑھ لیتے اور ان کو یاد بھی رہتا کہ کون سا واقعہ یا بات کس صفحہ پر ہے۔ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا۔ انہوں نے اس فضل خداوندی کا اظہار اپنے قلم سے خوب کیا۔ مشکل سے مشکل

موضوعات پر انہوں نے لکھا اور لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ انگریزی ان کی مادری زبان تھی مگر پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب کا یہ خاص کمال تھا کہ وہ بہت ہی آسان زبان میں مشکل سے مشکل بات کر سکتے تھے اور لکھ بھی سکتے تھے۔ ان کی تحریروں کی سب سے بری خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت آسان سلیس زبان میں ہیں۔ میں نے ان سے امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر لکھنے کے لئے عرض کیا، انہوں نے امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر ایک تحقیقی مقالہ ”امام احمد رضا علیہ الرحمۃ کی عالمی اہمیت“ (World Importance of Imam Ahmad Raza) کے نام سے لکھا۔ اس تحقیقی اور جامع مقالہ میں ڈاکٹر ہارون نے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر اس سے بہتر شاید ہی کسی نے اس طرح گہرائی و گیرائی، علمی، تحقیقی انداز میں لکھا ہوگا۔ احقر نے اس مقالہ کو ”ماہنامہ دی اسلامک ٹائمز“ میں شائع کیا پھر اس کو کتاب کی شکل میں طبع کرایا پھر اس کا ترجمہ ڈاکٹر ظفر اقبال نوری صاحب سابق صدر انجمن طلباء اسلام پاکستان نے احقر کی فرمائش پر کیا۔ نیز یہی ترجمہ میں نے اشاعت کے لئے ماہنامہ اعلیٰ حضرت بریلی شریف روانہ کیا اور شائع ہوا۔ یہ ترجمہ کراچی، لاہور اور دیگر جگہوں سے بھی شائع ہوا مگر کسی بندہ خدا نے یہ زحمت گوارہ نہ کی کہ جستجو کی جائے کہ مترجم کون ہے؟

یہ مقالہ شائع ہوتا رہا اسے خوب پسند کیا گیا، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ایسا عظیم کام مجھ سے ادنیٰ کے ہاتھوں کیوں ہوا؟ بعض حضرات نے اپنی تحقیق (گھر بیٹھے) سے لکھ دیا کہ ڈاکٹر محمد ہارون نے امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتابیں پڑھ کر اسلام قبول کیا لیکن حقیقت سے اس کا ذرہ برابر تعلق نہیں۔ 1988ء تک کتنی کتابیں امام احمد رضا خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی انگریزی میں چھپی تھیں۔ کیا ان بزرگوں میں کوئی بتا سکتا ہے؟ شاید اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہو۔ میں ڈاکٹر محمد ہارون سے مسلسل اصرار کرتا رہتا کہ امام احمد رضا خان رحمۃ



اللہ تعالیٰ علیہ پروہ مزید لکھیں مگر وہ کہتے کہ مجھ کو اصل کتابیں انگریزی میں دو کہ امام صاحب نے کیا لکھا ہے یا کوئی خاص اشارہ کسی خاص موضوع پر کیا ہو۔

بہر حال میں نے امام احمد رضا کے ایک رسالے ”تدبیر فلاح و نجات و اصلاح“ کا ترجمہ ایک ساتھی ڈاکٹر محمد رضا سے کرایا جس میں امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ نے چار نکات لکھے ہیں۔ یہ ترجمہ جب تیار ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کو بہترین اور معیاری انگریزی میں احقر کے تعاون سے ایڈٹ کیا اور پہلے دو نکات پر پانچ جامع تحقیقی مقالات لکھے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے اتنے مفصل علمی گہرائی اور گیرائی سے کسی بھی اہل علم و قلم نے نہیں لکھا۔ ہم نے ان مقالات کو ماہ ”اسلامک ٹائمز“ میں پانچ اقساط میں شائع کیا اور پھر پانچ مقالات کتاب بنا کر انگریزی میں شائع کیا۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر مولانا عبدالنعیم عزیزی صاحب بریلی شریف (بھارت) کا جنہوں نے خود ہی ان مقالات کو اردو میں ترجمہ کر دیا جو ہم نے کتابی صورت میں شائع کر دئے۔ پاکستان میں بھی کراچی والا ہور سے یہ مقالات شائع ہوئے۔

اس دوران ہم کوشش کرتے رہے کہ امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتابوں کے انگریزی تراجم مزید شائع کریں۔ ہماری تحریک پر تراجم ہم کو ملنے لگے۔ اگرچہ ترجمے بہت ہی کمزور اور پرانی انگریزی میں تھے ان کو ہم نے خوب محنت کے ساتھ ایسا تیار کیا کہ اگر امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی یہ کتب انگریزی میں ہوتیں تو یقیناً بالکل ایسی ہی ہوتیں۔ ڈاکٹر محمد ہارون صاحب نے ایڈیٹنگ کا کام کیا۔ میں ان کی مدد کرتا کیوں کہ میں اردو جانتا تھا، وہ اردو نہیں جانتے تھے، اس طرح ہم دونوں مل کر یہ کام کرتے رہے اور ترجمے تیار ہو کر چھپنے لگے۔ یہ تراجم بشیر حسین ناظم صاحب، ڈاکٹر مولانا عبدالنعیم عزیزی صاحب، ڈاکٹر مطلوب حسین صاحب، ڈاکٹر محمد رضا صاحب، پروفیسر غیاث الدین قریشی صاحب، ڈاکٹر محمد جونیجو صاحب، محمد افضل حبیب صاحب اور طاہر ستار صاحب نے کئے۔

یہ سلسلہ آہستہ آہستہ مزید آگے بڑھنے لگا۔ دوسرے اہل علم نے بھی تراجم کئے۔ اس عرصہ میں پروفیسر غیاث الدین قریشی صاحب نے ”تمہید ایمان“ کا ترجمہ کیا۔ پروفیسر صاحب کی انگریزی اچھے معیار کی تھی مگر آسان نہیں تھی۔ ڈاکٹر محمد ہارون صاحب نے ان کی انگریزی کو نہایت آسان اور اعلیٰ معیار کا بنایا۔ احقر کے بار بار اصرار پر پروفیسر غیاث الدین قریشی صاحب مرحوم نے ”حدائق بخشش“ کی لغتوں کا منظوم انگریزی ترجمہ شروع کیا اور یہ تراجم بہت پسند کئے گئے اور ہمارے ادارہ نے انہیں کتابی صورت میں تیار کر شائع کیا۔

ڈاکٹر محمد ہارون صاحب اس پر نظر ثانی کرتے اور کئی بار ایسا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے پوچھتے یا اگر پروفیسر غیاث الدین قریشی صاحب ہوتے تو ان سے پوچھتے کہ امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اتنا اعلیٰ پایے کا کلام ہے یا قریشی صاحب اس کو اعلیٰ بنا کر ترجمہ کر رہے ہیں تو میں اور قریشی صاحب انہیں بتاتے کہ یہ تراجم امام کے کلام کے سامنے کچھ بھی نہیں اور قریشی صاحب فرمادیتے کہ میرا ترجمہ اصل کلام کے مقابلے میں 80% ہے اور ڈاکٹر صاحب کہتے امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی شان ایسی ہی تھی کہ ان کا کلام اعلیٰ پایے کا ہونا چاہئے۔ اور جب دوسرے تراجم ڈاکٹر ہارون نے ایڈٹ کئے تو وہ سمجھنے لگے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ اس مقام کے لائق ہیں اور گزشتہ دور کے بزرگوں کے جانشین کی شان ایسی ہی ہونی چاہئے کہ ان کے کلام نظم و نثر اعلیٰ معیار کے ہوں۔ ہم نے کوشش کی کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے ”دس تعلیمی نکات“ ترجمہ کروا کر ڈاکٹر صاحب کو دیں تاکہ وہ اس موضوع پر بھی لکھیں جیسا وہ پہلے دوسرے موضوعات پر لکھ چکے ہیں۔ یہ کام محترم محمد افضل صاحب نے بخوبی انجام دیا۔ اور پھر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب نے اس موضوع پر بھی اعلیٰ معیار کے دو علمی اور تحقیقی مقالات لکھے اور لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ ڈاکٹر محمد ہارون ایک بین الاقوامی دانشور تھے اور جو کچھ وہ لکھتے وہ بین الاقوامی معیار کا ہوتا اور اتنی گیرائی و



گہرائی سے امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر پہلے کسی نے نہیں لکھا۔ یہ ڈاکٹر محمد ہارون کے مقدر میں تھا کہ نو مسلم ہو کر بھی انہوں نے وہ کام کیا جو برصغیر پاک و ہند کے سنی اسکالرز کو کرنا چاہئے تھا مگر یہ ان کے مقدر میں تھا اور انہوں نے کر دیا۔ اور اس علمی انداز میں کیا کہ ان کی خدمات کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ ایسے فکر و نظر والا دانشور اس صدی میں شاید ہی ہوا ہو۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے بے شمار مقالات لکھے اور وہ تمام مقالات اس قابل ہیں کہ ان کو کتاب بنا کر شائع کیا جائے اور جلد ایسا ہوگا انشاء اللہ العزیز۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان کی 20 کتابیں شائع ہوئیں نیز انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ بہت ہی اعلیٰ معیاری انگریزی میں کیا اور تفسیر قرآن پر بھی انہوں نے کام شروع کیا اور آخری پانچ سپاروں کی تفسیر لکھی۔

ان کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

- (۱) میلاد النبی ﷺ (۲) غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۳) اسلامی سرائیں (۴) اسلامی ریاست (۵) اسلامی معاشرہ کا قیام (۶) اسلام اور شراب (۷) اسلام میں عورت کا مقام (۸، ۹) بنیاد پرستی دو حصے (۱۰) میں مسلمان کیوں ہو (۱۱) قادیانی سے مسلمان خبردار رہیں (۱۲) حزب التحریر سے مسلمان خبردار رہیں (۱۳) عصمت انبیاء (۱۴) امام احمد رضا کی عالمی اہمیت (۱۵) سائنس کے حدود (۱۶) قرآن آخری کلام الہی (۱۷) امام احمد رضا کا عالمی منصوبہ (۱۸) سورہ یٰسین کا ترجمہ اور تفسیر (۱۹) اسلام اور اللہ کی حاکمیت اعلیٰ (۲۰) امام احمد رضا کی 1912ء کی پالیسی۔

یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر محمد ہارون ایک سچے مسلمان تھے۔ انہوں نے اسلام کے لیے اپنی مختصر زندگی میں جو اعلیٰ اور معیاری کام کیا یہ کام ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا ورنہ بڑے بڑے اس کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر محمد ہارون صاحب قبول اسلام کے روز اول ہی سے ایسے نہیں تھے مگر ان کو اس راستے

پوری طرح گامزن کرنے میں احقر کا بڑا عمل دخل ہے اور اگر میری ان سے ملاقت نہ ہوئی ہوتی تو شاید وہ اتنا کام نہ کر پاتے جتنا انہوں نے کیا ہے۔ الحمد للہ ذالک!

نو مسلم برطانوی مسلمان پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب جہاں ایک بڑے بین الاقوامی اسکالر اور صاحب علم و فضل تھے اتنے ہی وہ مخلص، سادہ اور معمولی اور عام زندگی بسر کرتے تھے۔ سنت رسول ﷺ کے مطابق زمین پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے اور بات بات میں رسول رحمت ﷺ کی احادیث، صحابہ اور بزرگان ملت کے اقوال کا حوالہ دیتے اور عمل بھی کرتے اور دوسروں کو بھی عمل کی تلقین کرتے نیز تحریروں میں جو کچھ لکھتے وہ دل سے ہوتا، پہلے وہ اس پر خود عمل کرتے پھر دوسروں سے بھی امید کرتے کہ وہ عمل کریں اور دنیا و آخرت دونوں کو سنوار لیں۔

میں نے زندگی میں بہت بڑے بڑے عالم، اسکالرز، پروفیسرز، ڈاکٹرز اور دانشور دیکھے ان سے بات چیت ہوئی، ان کی تقریریں سنیں، ان کی کتابیں پڑھیں مگر ان میں وہ بات نہیں جو ڈاکٹر محمد ہارون صاحب کی باتوں، تقریروں اور تحریروں میں ہے۔ یہ صرف میرا ہی تاثر نہیں ہے بلکہ یہ ہر فرد کا تاثر ہے جس نے ڈاکٹر محمد ہارون صاحب کو دیکھا، سنا، پڑھا ہوگا۔ میں نے خود جو دن ان کے ساتھ بسر کئے اور علمی و دینی کام کئے ان کی علمی معاونت سے ممکن ہوا اور مجھ سے زیادہ وقت ان کے قریب کسی نے نہ بسر کیا ہوگا اس دوران میں میں نے ان سے بہت زیادہ سیکھا ہے اور اب وہ عملی زندگی میں کام آ رہا ہے الحمد للہ! ہمارے مذہبی رہنماؤں نے ان کو اپنے قریب آنے دیا اور نہ ان کے قریب گئے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان بزرگوں میں کسی علمی کام کرنے یا کروانے کی نہ ہی حیثیت تھی اور نہ ہی جذبہ۔ کاش ہمارے بزرگان عظام اور علمائے کرام اس طرف توجہ دیں اور اس طرح سنی عوام اور مذہب کو جو فائدہ اور استحکام ہوگا وہ تحیل سے بھی بلند ہے۔



# رضا اکیڈمی انٹرنیشنل

## ☆ تعارف و خدمات ☆

ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی، بریلی شریف

جب کوئی مرد خدا خلوص نیت کے ساتھ دین و ملت کی خدمات جلیلہ کے لئے قدم اٹھاتا ہے تو فضل الہی اور رحمت رسالت پناہی ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتی ہیں اور وہ راستے میں حائل بڑی سے بڑی چٹان کو ایک تودہ کی مانند ٹھوکروں سے اڑاتا ہوا، پتھروں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتا ہوا منزل کی جانب بڑھتا رہتا ہے اور کامیابیاں اس کے قدم چومتی رہتی ہیں۔

ایسے ہی ایک بندہ خدا محترم الیاس قادری صاحب کشمیری نے بے سروسامانی کے عالم میں 23 اگست 1979ء کو اسٹاکپورٹ، برطانیہ میں 14 ویں صدی ہجری کے مجدد اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کی حیات اور دینی تجدیدی، علمی و دیگر تقدیری کارناموں سے عالم اسلام اور عالم انسانیت کو روشناس کرانے کے لئے ”رضا اکیڈمی انٹرنیشنل“ کی بنیاد رکھی۔

محترم کشمیری صاحب جانب منزل اکیلے ہی چلے تھے، ان کے جذبہ کے خلوص اور عزم مصمم کو دیکھتے ہوئے انکا ساتھ دینے کے لئے درد مندان ملت اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر ایک کارواں بن گیا۔

### درد مندان ملت کا کارواں

#### رضا اکیڈمی کے ابتدائی عہدیدار

- (۱) حضرت علامہ مولانا پیر سید ابوالکمال برق نوشاہی قادری (سرپرست اعلیٰ) (۲) جناب پروفیسر حنیف اختر فاطمی (صدر) (۳) جناب پروفیسر غیاث

الدین قریشی (نائب صدر) (۴) جناب محمد الیاس کشمیری (بانی و جنرل سیکریٹری) (۵) پیر سید معروف حسین (بریڈ فورڈ) (۶) جناب محمد خطاب (غزالی) (۷) پروفیسر محمد آصف حسین۔

#### اشاعتی کاموں کی ابتداء

1979ء میں پروفیسر غیاث الدین قریشی کا ”سلام رضا“ کا منظوم انگریزی ترجمہ شائع ہوا، 1980ء میں امام احمد رضا کی تصنیف ”الدولة المکیة“ پروفیسر حنیف اختر فاطمی کا انگریزی میں طویل تحقیقی مقالہ شائع ہوا۔ 1981ء میں منظرِ عالم کی حیات مقدسہ پر دو انگریزی کتابیں شائع ہوئیں۔ 1983ء میں امام احمد رضا کے اردو ترجمہ قرآن ”کنز الایمان“ کا انگریزی ترجمہ جسے پروفیسر حنیف اختر فاطمی نے ”ورلڈ اسلامک مشن“ کے لئے کیا تھا لیکن وہ چھپا نہیں پائے تھے اسے رضا اکیڈمی نے 1984ء میں شائع کیا۔ شیطان رشدی کے رد میں 1988ء میں الحاج محمد الیاس صاحب اور پروفیسر آصف حسین صاحب نے ”Western politics & Satanic verses“ نام کی معرکہ آرا کتاب لکھی جو بہت ہی مقبول ہوئی اور ایک سال کے اندر اس کے 3 ایڈیشن شائع ہوئے۔

#### ایک اور انقلابی قدم: دی اسلامک ٹائمز کا اجراء

1985ء میں الحاج محمد الیاس صاحب قادری نے ایک انگریزی ماہنامہ ”دی اسلامک ٹائمز“ کا اجراء کیا۔ یہ رسالہ 2005ء میں اپنا بیس سالہ کامیاب سفر طے کرنے کے بعد 21 ویں سالہ منزل کی طرف خوش اسلوبی سے گامزن ہے۔ شروع سے اب تک اس رسالہ کے لکھنے والوں میں مندرجہ ذیل اسماء قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر حنیف اختر فاطمی، پروفیسر غیاث الدین قریشی، برطانوی نو مسلم ڈاکٹر محمد ہارون، محمد ارشد چوہان، محمد خطاب، محمد افضل حبیب، ڈاکٹر محمد اسلم جونجو،



پروفیسر آصف حسین، پروفیسر محمد مسعود احمد (کراچی)، محمد طاہر خاں اور راقم ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی (بریلی شریف) صاحبان، نیز نو مسلمہ امینہ براقا صاحبہ، نو مسلمہ محترمہ مریم اور بہت سے نئے قلم کاروں کے تعاون شامل ہیں۔

### رضا اکیڈمی کے فلمی معاونین

مندرجہ بالا صاحبان علم و قلم کے علاوہ رضا اکیڈمی کے فلمی معاونین میں حسب ذیل اسماء بھی قابل ذکر ہیں:

جناب بشیر حسین ناظم، جناب غلام مرتضیٰ سعیدی، مولانا محمد اسماعیل، مولانا گلزار حسین قادری، جناب محمد ضیاء وغیرہم۔ یہ حضرات رضا اکیڈمی کے موجودہ ممبران میں بھی شامل ہیں۔

### اسلامک ٹائمز (اردو)

رضا اکیڈمی انٹرنیشنل کے بانی و چیئر مین الحاج پیر محمد الیاس کشمیری صاحب نے بریلی شریف، انڈیا سے راقم ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی کی نگرانی اور ادارت میں اردو "اسلامک ٹائمز" بھی جاری کرایا جو لگ بھگ 2 سال تک خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رہا لیکن بعد میں قانونی وجوہ سے اسے بند کرنا پڑا۔

### رضا اکیڈمی کی سلور جوبلی

1904ء میں "رضا اکیڈمی" نے اپنا 25 سالہ کامیاب تحقیقی و اشاعتی سفر طے کرنے پر "سلور جوبلی" منائی اور اس موقع پر انگریزی و اردو میں دسیوں کتابیں طبع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ برطانیہ و دیگر مغربی ممالک اور برصغیر ہندو پاک کے مشاہیر علماء و مشائخ اور صاحبان علم و قلم نے خراج تحسین پیش کئے اور محترم حافظ محمد وسیم قادری (لاہور، پاکستان) نے ایک کتابچہ "رضا اکیڈمی انٹرنیشنل تعارف و خدمات" لکھ کر شائع کیا۔

### رضا اکیڈمی کی خاص مطبوعات

رضا اکیڈمی انٹرنیشنل نے اب تک اپنے 26، 27 سالہ اشاعتی سفر میں

اسلامیات و دینیات اور رضویات پر انگریزی اور اردو میں تقریباً 200 کتابیں شائع کی ہیں۔ بیشتر انگریزی تصنیفات و تالیفات کے اردو تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ خود اکیڈمی کے بانی و چیئر مین الحاج پیر محمد الیاس صاحب قادری مدظلہ کی بھی کئی تصانیف شامل ہیں۔ سب سے زیادہ تحریری کام ڈاکٹر محمد ہارون مرحوم کا ہے۔ راقم عبدالنعیم عزیزی کے 3 اردو تراجم اور 13 انگریزی تراجم (تصانیف رضا کے) رضا اکیڈمی نے شائع کئے ہیں۔ ادارہ کی چند خاص کتابیں اس طرح ہیں:

قرآن مجید (کنز الایمان) کا انگریزی ترجمہ، میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟ سنی راستہ، امام احمد رضا کی عالمی اہمیت، امام احمد رضا کا عالمی منصوبہ، امام احمد رضا کو خراج عقیدت، امام احمد رضا اور برطانوی نو مسلم، اسلام اور عورت، حزب التحریر کے متعلق وارننگ، فتاویٰ الحرمین، اسلامی بنیادی عقائد، حسام الحرمین، سچائی کی تلاش، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت، بچوں کا اسلام، وغیرہ۔

(نوٹ: طوالت کے خوف سے کتابوں کے انگریزی نام نہیں لکھے گئے ہیں)

### پیر محمد الیاس صاحب کا حوصلہ بلند

گو الحاج پیر محمد الیاس صاحب قادری کے خاص رفقاء میں ڈاکٹر حنیف اختر فاطمی، پروفیسر غیاث الدین قریشی، ڈاکٹر محمد ہارون، پروفیسر محمد یوسف (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم)، ان حضرات کا ایک ایک کر کے اٹھ جانا الحاج محمد الیاس صاحب کے لئے ایک عظیم حادثہ تھا مگر مصائب و آلام نے ان کی لگن کو اور تیز کر دیا۔

آلام روزگار کو آساں بنادیا

جو غم تھا اسے غم جاناں بنادیا

الحاج محمد الیاس صاحب اپنی منزل کی جانب بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے صاحبزادگان کو بھی اس اہم دینی و ملی خدمات میں لگالیا ہے۔ ان کا یہی



## حرفے چند

الحاج محمد الیاس کشمیری

ڈائریکٹر رضا اکیڈمی برطانیہ

آج اسلام کو سیاسی محاذ پر بہت سارے اور مسلسل جاری رہنے والے مسائل کا سامنا ہے۔ مسلمانوں پر حکمرانی کرنے والی موجودہ ریاستیں تباہ کن حد تک ناکام ہو چکی ہیں۔ ”اسلامی تصور ریاست“ پر لکھی جانے والی پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون مرحوم کی یہ کتاب نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب مرحوم نے اصل کتاب انگریزی میں بعنوان ”Islamic Concept of State“ لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ غلام مرتضیٰ سعیدی (لاہور) نے کیا ہے۔ پوری کتاب پر ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی (بریلی شریف) نے نظر ثانی کر کے اس کے نوک پلک درست کئے ہیں۔

زیر نظر کتاب اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ اصل اسلام (روایتی اسلام) کی طرف رجوع ہی تمام مسلم مسائل کا حل ہے جس کا مجدد اسلام امام احمد رضا بریلوی نے تازندگی دفاع کیا ہے۔

موجودہ مسلم ریاستی تصور دراصل مغرب کی نقالی ہے جو اسلامی تصور ریاست سے یکسر جدا گانہ ہے اور اسی نے پوری دنیا میں اسلام کی ایج کو خراب کر رکھا ہے اور مسلمان ہر مقام پر شکست و ریخت سے دوچار ہیں۔

اسلام کا حقیقی مرکز امت ہے۔ اسلام میں سیاسی اختیارات کی ضرورت اس

عالم ہے۔

برق گرتی ہی رہی طوفان مچلتے ہی رہے  
چلنے والے بھی بلا کے تھے کہ چلتے ہی رہے  
محمد الیاس صاحب کی قربانیاں لائق تحسین ہیں۔ رب کائنات انہیں دونوں جہان کی سرخروئی عطا کرے، ان کو اور ان کے خاندان کو سرسبز و شاداب رکھے۔ آمین!  
بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

2006ء کی یہ مطبوعات بھی

اس سچائی کے مظہر ہیں۔

اہل مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی سے ہر ذی شعور مسلمان خوب واقف ہے۔ برطانیہ جیسے ملک میں دین و سنیت کی ترویج و اشاعت اور غلبہ اسلام کا کارنامہ انجام دینا کس قدر دشوار اور خطرہ سے پر ہے، یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایسے عالم میں ”رضا اکیڈمی“ کی دینی و ملی خدمات یقیناً لائق ستائش ہیں اور اس ادارہ کی قلمی، علمی، اور مالی معاونت ہر مخیر اور دردمند سنی مسلمان کا ملی فریضہ ہے۔

مخیرین قوم مندرجہ ذیل پتوں پر رابطہ کر سکتے ہیں:

(1) Alhaj M. Ilyas Kashmiri

138; Northgate Road. Edgeley, Stockport SK3 9NL  
(England).

Phone: 0161-4771595,

Phone/Fax: 0161-2911390

(2) Dr. A. Naim Azizi

104, Jasoli, Bareilly, U.P. India

Phone: 0581-2476775



لئے ہے کہ امت کی خدمت کیجائے اور اسلام کو غالب!  
 زیر نظر کتاب میں فاضل مصنف اور عالم اسلام کے نامور اسکالر ڈاکٹر محمد  
 ہارون مرحوم نے یہ لکھا ہے کہ موجودہ مسلم ریاست کی تشکیل جو دراصل مغرب کی  
 نقالی ہے، کی ہی وجہ سے مغرب مسلمانوں پر غالب آ گیا ہے۔  
 ریاست کے مسئلہ کا اصلی حل قدیم سیاسی ڈھانچے کی طرف واپسی ہے۔  
 ضرورت ہے کہ اس روایت کو سمجھا جائے اور طے کیا جائے کہ عصر حاضر کے پیدا  
 کردہ مسائل کو روایت سے کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ ہدف ہے جسے ڈاکٹر محمد  
 ہارون صاحب نے اپنے لئے منتخب کیا ہے جسے ایک اہم نکتہ بننا چاہئے جس سے  
 مسلم دنیا کے مسائل کے بارے میں کسی سنجیدہ اور ٹھوس غور و فکر کا آغاز کیا جائے۔  
 ڈاکٹر محمد ہارون کے مطابق عروج نو کے حصول کے لئے مسلمانوں کو  
 حضرت امام غزالی اور حضرت امام احمد رضا قدس سرہما جیسے اشخاص کی سیاسی فکر کی  
 طرف لوٹنا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے دکھایا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے  
 جو کہ مسلمانوں کے وقار اور ان کی بحالی کی کلید ہے۔  
 راقم کو امید ہے کہ قارئین اس کتاب کی بے مثال اہمیت کا ادراک کریں  
 گے اور اپنی فکری راہنمائی کے لئے اسے استعمال کریں گے اور مسلمانوں کے  
 لئے کامیابی اور عروج واپس لائیں گے۔

## کچھ اس کتاب کے بارے میں

ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی۔ بریلی شریف

مذہب کے بعد سیاست کو سب سے بڑی طاقت تسلیم کیا گیا ہے اور اسی لئے  
 اسلام نے دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح سیاسی شعبہ حیات پر بھی مذہب کی  
 حکمرانی برقرار رکھی ہے تاکہ مذہب سے آزاد رہ کر سیاست چنگیزیت کا روپ نہ  
 دھار لے۔

آج پوری مسلم دنیا میں کسی بھی مسلم ملک کی حکومت و سیاست پر مذہب کی  
 گرفت ہے اور نہ ہی علماء کا عمل دخل۔ مسلم ریاستوں کے حکمران اور سربراہ دین و  
 شریعت سے بے بہرہ اور خود غرض ہیں اور حکومتی نظام فوج، پولیس اور افسران  
 چلاتے ہیں۔ مسلمانوں میں اختلاف رائے، تعصب اور خود غرضی کوٹ کوٹ کر  
 بھری ہوئی ہے۔

پوری دنیا میں پچاس سے زائد مسلم ریاستیں ہیں لیکن خود اپنی ہی ریاست  
 میں مسلمان حیران و پریشان ہیں۔ پوری دنیا میں عظیم الشان اسلامی طاقت کا  
 فقدان ہے جو بربریت کو روکنے سے قاصر ہے۔ ہر ملک میں حکمران گروہ الگ  
 الگ ہیں، کہیں شاہی خاندان کی حکومت ہے، کہیں فوجی حکومت ہے اور کہیں کسی  
 سیاسی جماعت کی۔

مسلم دنیا کے انہیں سیاسی حالات و معاملات کو مد نظر رکھتے ہوئے برطانوی  
 نو مسلم پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون مرحوم (م ۱۹۹۸ء) نے انگریزی میں ایک بہت  
 ہی پر فکر کتاب بنام "Islamic concept of State" لکھی تھی جس



کا اردو ترجمہ عالی جناب غلام مرتضیٰ سعیدی (لاہور) سابق صدر انجمن طلبہ اسلام، پاکستان نے کیا ہے۔ سعیدی صاحب اس سے قبل ڈاکٹر محمد ہارون (مرحوم) کی "Why i accepted Islam" کا بھی ترجمہ کیا تھا اور یہ ترجمہ بہت ہی پسند کیا گیا۔ سعیدی صاحب نے یہ ترجمہ اس انداز میں کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ کتاب انہوں نے ہی لکھی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون مرحوم واقعی مفکر اسلام اور جینیس (Genius) تھے۔ انہوں نے اس کتاب میں دکھایا ہے کہ موجودہ مسلم ریاستیں دراصل مغرب کی نقالی اور مغربی ریاستی نظام کا چرہ بہ ہیں۔

پروفیسر محمد ہارون نے اس کتاب میں مغربی ریاستی نظام..... نازی ازم، فسطائیت، اشتراکیت اور دوسری مسلم حکومتوں کے سربراہوں..... سوڈانی حکومت، مصری و ایرانی حکومت کا بھی جائزہ پیش کیا ہے نیز ایران کے حوالے سے شیعہ ریاستی نظریہ کو بھی اجاگر کیا ہے۔ بوسنیا، کشمیر، فلسطین، اور چیچنیا وغیرہ کے مسلمانوں کے حال زار اور ان پر کئے جانے والے مظالم کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ وہابی، مودودی اور حزب التحریری نظریہ ہائے ریاست کو کنڈم کیا ہے۔ پروفیسر مرحوم کی ژرف نگاہی، تاریخ، اور اپنے عہد کی سیاست پر ان کی گہری نظر، ژرف نگاہی اور خورد بینی جائزہ نگاری لاریب قابل داد ہے۔ زیر نظر کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

### باب اول: مسلم دنیا کے مسائل اور انکا حل:

اس باب کے تحت ڈاکٹر محمد ہارون مرحوم لکھتے ہیں کہ زیادہ تر مسلم ریاستوں کے حکمران غرض ہیں اور مغرب کے پروردہ۔ ان کی نفسانیت کیوجہ سے مسلم دنیا میں بھانت بھانت کے مسائل نے جنم لے لئے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ بے غرض حکومت کا قیام ہو اور یہ حل علماء اور عامۃ المسلمین خود تلاش کریں۔

### باب دوم: اللہ واحد کی حاکمیت اور استبدادیت:

اس باب میں ڈاکٹر محمد ہارون مرحوم نے دکھایا ہے کہ صرف قدیم اسلام ہی اللہ واحد کی حاکمیت قائم کر سکتا ہے۔

قدیم اسلام سے ان کی مراد ہے "اصل اسلام" یا "روایتی اسلام" جس پر ہمارے اسلاف قائم تھے اور کامیابی و کامرانی ان کے قدم چومتی تھیں۔ لیکن افسوس! آج اس اسلام کی ایج برہاد کر دی گئی ہے اور وہابی و مودودی نیز حزب التحریری اجتہاد کا سہارا لیکر شریعت کو پامال کر رہے ہیں۔ مزید تحریر کرتے ہیں کہ اپنے اپنے عہد میں حضرت امام غزالی اور روایتی علماء نے محسوس کیا کہ ہر حوالہ سے سلطان کی تلاش بے سود ہے اس لئے بہتر تھا کہ موجودہ حکمران کو تسلیم کر کے اسے شریعت میں اتارا جائے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے آگے جانے کا راستہ بہر صورت آزاد مسلم معاشرہ سے شروع ہوتا ہے اس کے لئے علماء و اولیاء کو چاہئے کہ موجودہ ریاستوں کو شرعی آئینی نظریے میں اتاریں۔ گویہ کام دیر طلب ہے لیکن آگے نکلنے کا یہی حقیقی راستہ ہے۔

### باب سوم: اللہ واحد کی حاکمیت کا خاتمہ اور مسلم

#### دنیا کے مسائل:

۱۹ویں صدی عیسوی کے آغاز تک قدیم اسلام کی سیاسی تنظیم "اللہ واحد کی حاکمیت" مسلم دنیا کے بڑے حصے کا احاطہ کئے ہوئے تھی لیکن مسلم دنیا میں مختلف مقامات اور اوقات میں مغرب کی مکمل فاتحانہ پیش قدمی کے ساتھ اس کا اختتام ہو گیا جیسے ترکی کی سلطنت عثمانیہ۔

قدیم اسلام میں سلطان کے پاس کوئی نظریاتی اختیار نہیں تھا۔ سلطان صرف ایک حکمران ہوتا تھا اور اس کے پاس کوئی مذہبی یا نظریاتی اختیار نہیں تھا۔



عدلیہ، اوقاف، تعلیمی نظام وغیرہ علماء کے اختیار میں تھے جہاں ہر کام شریعت کی روشنی میں انجام پذیر ہوتا تھا۔ مسلم معاشرہ کسی بھی طرح سلطانی یا حکومتی دباؤ، ظلم اور کرپشن سے آزاد تھا۔ جدید ریاست اسلام سے قطعاً اجنبی ہے اور یہ دراصل مغرب کی دین ہے۔

### باب چہارم: مسلم دنیا کے مسائل کا علاج اور روایتی علماء کے کردار کی بحالی:

پروفیسر صاحب نے بڑی دو ٹوک بات کہی ہے کہ مسلم دنیا کے مسائل کا علاج روایتی علماء کے کردار کی بحالی پر منحصر ہے۔ اور واضح کر دیا ہے کہ اب امام احمد رضا جیسے علماء ناپید ہیں اور جوان کے نقش قدم پر کچھ حد تک چلتے نظر بھی آتے ہیں، انہوں نے اپنا وقار کھو دیا ہے اور آج علماء کی صف میں نام نہاد، دنیا طلب اور لیڈر ٹائپ کے زبردستی کے علماء شامل ہو گئے ہیں اور یہی سبب ہے کہ مسلم دنیا کے مسائل بجائے حل ہونے کے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

### باب پنجم: کیا اسلام مطلق العنان ہے؟

اہل مغرب اور مغربی تہذیب کے رسیانیز جدیدیت کے متوالوں کا یہ اعتراض ہے کہ معاذ اللہ ”اسلامی ریاست مطلق العنان ہے“۔ اس اعتراض کا بہت ہی بلیغ رد ڈاکٹر صاحب مرحوم نے فرمایا ہے: وہ کہتے ہیں کہ مطلق العنانیت کی کتنی بذات خود ریاست اور اس کا پوجا جانا ہے۔ شیعیت میں یہ نظریہ ہے کہ حکمران اللہ کا چنا ہوا ہوتا ہے اور اس کا تعلق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان سے ہوتا ہے اور یہی بات لوگوں کو ریاست کی پرستش کی طرف گامزن کر سکتی ہے۔

یہاں امام عام مسلمانوں سے بلند و برتر مانا جاتا ہے۔ ان کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور مجتہد کو تہذیبی شریعت کا اختیار ہے حالانکہ اسلامی رو سے

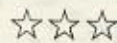
اب دروازہ اجتہاد بند ہو چکا ہے۔ ”مودودی جماعت“ اور ”تحریک حزب التحریر“ کا بھی یہی نظریہ ہے۔

### باب ششم: اسلامی ریاست کا حقیقی تصور:

قدیم ریاست کا اسلامی تصور واپس اسلام کی طرف لے جاتا ہے۔ خلافت کے بعد اسلام میں یہ ریاست کا مرکزی تصور تھا اور مغرب کی آمد تک اسی نظریہ نے مسلم حکومتوں کی رہنمائی کی۔ مسلم ریاستوں کے زوال و سقوط کا سلسلہ ۱۸ ویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔

خلافت کے سوا (چونکہ اس میں قرشیت کی شرط ہے) اسلامی ریاست کا حکمران کوئی بھی شاہ یا قبائلی رہنمایا کوئی اور ہو سکتا ہے جو علم شریعت سے واقف اور اس پر کار بند ہو۔ حکومت بہر حال اللہ تعالیٰ کی ہونی چاہئے نہ کہ فرد کی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے آخر میں بوسنیا کے حال زار، مسلم دنیا کی اس کی طرف سے بے رخی اور تغافل کی بھی جھلک پیش کی ہے اور دکھایا، کہ بوسنیا کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی سب سے بڑی ذمہ داری برطانوی وزیر خارجہ ڈگلس ہرڈ (Douglas Hurd) پر عائد ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کے تصور پر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب مرحوم کا تجزیہ بے مثل ہے۔ زیر نظر کتاب زبردست اہمیت کی حامل، قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔





## مسلم دنیا کے مسائل اور ان کا حل

ہم اس باب کا آغاز مسلم دنیا اور مسلمانوں کے مسائل سے کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کو حل کیسے کیا جاسکتا ہے۔ ایک سادہ رائے تو یہ ہے کہ یہ کتنا ہی وسیع اور مشکل موضوع ہے۔ مسلم دنیا ایک ہزار کروڑ نفوس پر مشتمل ہے، چالیس سے زائد ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور باقی ماندہ تمام ممالک میں اقلیت میں۔ ان کے مسائل بے شمار ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کے بہترین اذہان ان میں سے کسی بھی مسئلے کی تفہیم کریں اور پھر اس کا حل تجویز کریں۔

ایک دوسری رائے یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اس سے نازک کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ کوئی بھی اخبار کھول لیجئے وہاں آپ پہلی ہی نظر میں بوسنیا سے لے کر کشمیر تک اور الجزائر سے لے کر فلسطین تک مسلمانوں کو درپیش مسائل نظر آئیں گے۔ امت مسلمہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے، امت اللہ تعالیٰ کا پیغام دنیا تک پہنچاتی ہے، اس طرح امت کے مسائل مجموعی طور پر انسانیت کے مرکزی مسائل ہیں۔

ایک تیسری رائے بھی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں میں بہت زیادہ اختلاف رائے ہے اور اس بات پر بھی اختلاف ہے کہ صحیح حل کیا ہے۔ بہت سارے مسلم ممالک میں ہم ایسے موضوعات پر گفتگو کے لئے مجلس منعقد کرنے پر گرفتار کر لئے جاتے ہیں لہذا ہم جب بھی اس موضوع پر گفتگو کریں تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے، سب سے بڑھ کر ہمیں اپنے تعصبات اور خو غرضیاں ایک طرف رکھنی ہوں گی۔

صرف اللہ تعالیٰ ہی حقیقت سے باخبر ہے۔ ہمیں لازماً اس بات کا احساس رہنا چاہئے کہ ہماری سوچ محدود اور ادھوری ہے۔ ہم مسلمانوں کو درپیش مسائل

پر نظر ڈالتے ہوئے بحث کا آغاز کر سکتے ہیں۔

### مسائل:

ایک سادہ رائے جس سے ہم آغاز کرنے لگے ہیں یہ ہے کہ مسلمانوں کو بڑی تعداد میں نہایت گمبیر مسائل کا سامنا ہے۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ مسائل کی فہرست بنا کر بنیادی مسائل چھانٹ لیں اور عام مسئلوں کو نظر انداز کر دیں۔

مسلمانوں کا سب سے نمایاں مسئلہ کسی عظیم الشان اسلامی طاقت کا فقدان ہے یہاں تک کہ کوئی بھی مسلم ملک فرانس اور برطانیہ ایسا طاقتور بھی نہیں۔ نتیجتاً مسلمان ملک کمزور ہیں اور ممکن ہے بہت سارے دشمنوں میں گھرے ہوئے بھی ہوں۔ یہ امر کشمیر، بوسنیا اور فلسطین کے مسائل کا اصل سبب ہے۔ کوئی بھی ملک اس قدر مضبوط نہیں کہ اس بربریت کو روک سکے۔ دوسرا مسئلہ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے۔ تمام مسلمان ملکوں کی حکومتیں خود غرضوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ ہیں کہ ریاست اور ملک کو محض اپنے لیے چلاتے ہیں اور مسلم امت کی ہرگز فکر نہیں کرتے یہاں تک کہ اپنے شہریوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

ہر ملک میں حکمران گروہ الگ الگ صورتوں میں موجود ہیں۔ کچھ ملکوں میں یہ شاہی خاندان کے روپ میں، کچھ میں فوج کی صورت میں اور کہیں سیاسی جماعت کے انداز میں موجود ہیں۔ عموماً یہ محض ایک گروہ ہوتا ہے جو کہ خفیہ پولیس کو چلاتا اور کنٹرول کرتا ہے۔

تیسرا مسئلہ دوسرے کا نتیجہ ہے۔ معیشت اور معاشرہ ان گروہوں کی منفعت کیلئے چلتا ہے اور مسلمان عوام نظر انداز کر دئے جاتے ہیں۔ تمام اچھے عہدے اور دولت خود آپ یا اپنے دوستوں کو دئے جاتے ہیں۔ یوں یہ معیشتیں نااہلی اور اسراف کے باعث تباہ ہو جاتی ہیں مگر ان جتھوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔

اگلا مسئلہ بالکل سادہ ہے وہ یہ کہ ریاستی انتظامیہ بد عنوان ہے۔ یہ جتنے ہر



چیز کو اس طرح گھماتے ہیں کہ خود انہیں فائدہ دے۔ ہر چیز برائے فروخت ہے، سرمایہ پیدا کرنے والا ہر ذریعہ لوٹا جاتا ہے۔ ان ریاستوں میں ہر افسر کو رشوت دی جاسکتی ہے۔

چونکہ معیشت اور ریاست بد عنوان جتھوں کے لیے چلتے ہیں اس لیے ایک اضافی مسئلہ عوامی غربت ہے۔ عام لوگ قاہرہ، بیروت اور استنبول ایسے شہروں کی گنجان کچی آبادیوں میں خیرات پر زندہ رہتے ہیں اور یہ خیرات بھی صرف ہنگاموں کے عوض دی جاتی ہے۔

نتیجے کے طور پر وہاں روزگار حاصل کرنے کی خاطر امریکہ، یورپ اور خلیج کی طرف ہجرت کے لیے بے پناہ دباؤ ہے۔ یورپ کے مسلمان یہاں پر صرف اس لیے ہیں کہ ان کے پاس زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر وہ مصر، ترکی یا کسی دوسرے ملک میں رہتے ہیں۔ چونکہ سیاست پر بد عنوان جتھوں کا راج ہے اس لئے سیاست کئی حوالوں سے پر تشدد ہے لہذا ان تمام ریاستوں کو عوام پر قابو پانے کے لیے پولیس گردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں مسلم دنیا کی ریاستیں پولیس اسٹیٹ ہیں، خفیہ پولیس ان ممالک کا حقیقی سیاسی ادارہ ہے۔

ان ملکوں میں سیاسی رواداری نام کی کوئی چیز نہیں، وہاں سیاست میں حصہ لینے کی آزادی نہیں، وہاں آزادانہ سیاسی تقریر کی بھی آزادی نہیں، وہاں میڈیا پر ریاستی کنٹرول ہے اور سنسر شپ ہے۔ سیاست ان جتھوں کی اندرونی اور باہمی جنگ بن جاتی ہے جو کہ ریاست پر کنٹرول کے لیے لڑی جاتی ہے یعنی اتحاد خانہ جنگی کی صورت اختیار کر جاتا ہے کیونکہ جنوبی گردہ یہ قبول نہیں کر سکتا کہ شمالی گردہ متحدہ ریاست پر غلبہ حاصل کرے۔

کوئی بھی سماجی یا معاشی تبدیلی ان گروہوں کی حکمرانی کے لیے چیلنج بن سکتی ہے۔ پیچہ کی منڈی سے متعلق اصلاحات متعارف کرانے کی کوششیں اس لیے

مسائل کا شکار ہو جاتی ہیں کہ ان گروہوں کو زک پہنچا سکتی ہیں۔

جب یہ ملک کو دیوالیہ کر دیتے ہیں تو پھر انقلاب کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ چند سال پہلے الجزیرہ کو قومی محاذ آزادی (F.L.N) چلا تا رہا یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر دیوالیہ ہو گیا تب وہاں کسی قسم کی معاشی اصلاح ناممکن تھی۔ وہاں صرف جنگ ہو سکتی تھی ان لوگوں کے ساتھ جو ”قومی محاذ آزادی“ سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن قومی محاذ آزادی، انہیں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لہذا نتیجہ ایک نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی۔ افغانستان میں کئی قسم کے جتھے روسیوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اب روسی جا چکے ہیں لیکن وہ جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ کون سا گروہ ملک چلا سکتا ہے۔

بے شک آپ ایک گروہ کو زیادہ سے زیادہ نوازنے کے لیے ملک نہیں چلا سکتے سوائے اس کے کہ تباہی اور بربادی ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم دنیا نا کام حکومتوں، نا کام معیشتوں اور نا کام معاشروں سے بھری ہوئی ہے، فلسفے بھی نا کام ہو چکے ہیں۔ اپنی حکمرانی کو جائز ثابت کرنے کے لیے وہ کئی قسم کے فلسفوں کی طرف رجوع کرتے ہیں مثلاً عرب قومیت پرستی، عرب سوشلزم، بعث ازم، کمیونزم وغیرہ۔

یہ تمام فلسفے اب نا کام ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی شخص ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں کرتا کہ یہ حکومتیں ان میں سے کسی بھی فلسفے پر یقین رکھتی ہیں جن کی ترجمانی کا وہ دعویٰ کرتی ہیں۔ یہ حکومتیں صرف خود غرضیت کی نمائندہ ہیں، ان جتھوں کی ناکامی کے باعث زیادہ تر مسلم ممالک لا چارگی کے عالم میں یورپ پر انحصار کیے ہوئے ہیں۔ مصری امریکی امداد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے جس سے نوے فیصد عوام کو روٹی میسر آتی ہے۔ بہت سارے مسلم ممالک باہر سے قرض لینے میں بے حد دلیر ہیں۔ خلیجی جنگ نے ثابت کر دیا کہ یہ حکومتیں اپنے فوجی



مسائل حل کرنے کے لیے بھی یورپ کی منتظر ہوتی ہیں۔

آپ کو یہ بات بہر حال ذہن نشین رکھنی ہوگی کہ یہ حکومتیں ہمیشہ نہیں تھیں۔  
نصر نے مغرب کو لکارا اور وہ پر امید تھا کہ دنیا کو مغرب کے مقابلے میں متحد کر  
لے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حکومت کی ناکامی کی تمام ذمہ داری سادات اور  
مبارک پر عائد ہوتی ہے۔ تاہم آج کل ان میں سے کوئی بھی حکومت مغرب کے  
مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ خلیجی جنگ نے عیاں کر دیا ہے کہ ان  
حکومتوں میں سے کوئی بھی اگر مغرب کو چیلنج کرے گی تو اس کے ساتھ کیا ہو  
سکتا ہے۔

اس ساری صورت حال کا ثمر یہ ہے کہ تمام مسلم دنیا میں بحران کا  
گہرا احساس چھایا ہوا ہے۔ مسلمان جس انداز میں زندہ رہ چکے ہیں مزید اس  
انداز میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ پس ان کے ہاں مسئلے کے حل کی شدید تلاش ہے۔  
اب ہم مسلمانوں کو درپیش مسائل کا جائزہ لے چکے ہیں لہذا ہم کوشش کر سکتے ہیں  
کہ مسائل یکجا کریں اور بنیادی مسئلے پر پہنچیں۔

وہ بنیادی مسئلہ موجودہ مسلمانوں کے پورے سیاسی اور سماجی کلچر کی کمزوری  
ہے۔ ”کمزوری“ کہنے کی حد تک ایک عام سالفظ ہے۔ سیاست اس انداز میں  
نظر نہیں آتی کہ وہ تمام مسلمانوں کے لئے مجموعی طور پر وقف ہو یا پورے  
معاشرے کے لئے یا تمام امت کے لئے ہو۔ سیاست ایسے دکھائی دیتی ہے کہ  
گویا ایک ایسا نظام ہے جو صرف چند لوگوں کی خدمت پر مبنی ہے۔

اصلہ مسئلہ یہ ہے کہ حکومت خود غرض ہے  
یہاں مجھ کو لازماً ایک اہم امر کی نشاندہی کرنی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت  
یہ کہتی ہے کہ اصل مسئلہ اتحاد کا فقدان ہے لیکن یہ مضحکہ خیز ہے کہ مسلم دنیا کی  
حکومتوں کو اتحاد کی دعوت دی جائے۔ دادا گیروں کے یہ گروہ کبھی بھی کسی

دوسرے سے متحد ہونے والے نہیں۔ یمن کی صورتحال سے صاف ظاہر ہے کہ  
جب بھی اتحاد کی کوشش کی گئی تو کیا نتیجہ نکلا۔ اگر وہ واقعی متحد ہو جاتے ہیں تو یہ  
صرف اپنے مفادات کے لئے ہوگا۔

آج کل تیونس، لیبیائی، مراکش، الجزائر اور مصری حکومتیں اپنے دفاع کے  
لئے یکجا ہو کر الجزائر ایسی صورت حال کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ اتحاد کا عام طور  
پر اس سے زیادہ کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ یہ حکومتیں امت کی راہنمائی کے لئے  
متحد ہو جائیں جبکہ ان کا مطمح نظر ان کا اپنا اقتدار ہے۔

بنیادی مسئلہ ایسی حکومتیں قائم کرنا ہے جن کی پہلی ترجیح معاشرہ ہو، مسلمان  
ہوں اور امت ہو۔ وہ مسئلہ جسے حل کرنا ہوگا وہ خود غرض حکومتوں کا مسئلہ ہے۔

### حل:

مسلمانوں کے مسئلے کا حل کیا انہیں بیان کرنا آسان ہے۔ مسلمانوں کو ایک  
ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہے جو بے غرض حکومت جنم دے، جو مسلمانوں کی  
خدمت کرے اور امت کی خدمت کرے نہ کہ صرف حکمرانوں کے اور ان کے  
مصاحبین کے ذاتی مفادات پورے کرے۔

اور اگر آپ غور سے نوٹ کر رہے ہیں تو میں نے لفظ سسٹم کہا ہے نہ کہ  
افراد! مسلم دنیا کو چلانے والے افراد نے سفر کا آغاز چھوٹے چھوٹے خود غرض  
جھٹوں کے طور پر نہیں کیا تھا، ان سب نے بطور مثالیت پسند شروعات کی تھیں،  
ان میں سے زیادہ تر نے کرپٹ گروہ کو بے دخل کر کے اقتدار سنبھالا تھا لیکن ان  
سب نے کوئی نہ کوئی ایسا سیاسی نظام اپنایا جس نے انہیں خود غرض بنادیا۔ انہوں  
نے استبدانہ نظام اور خصوصاً مطلق العنان نظام منتخب کئے جس کے ذریعے وہ  
تمام ملکی دولت اور اختیارات اپنے تصرف میں رکھتے۔ ایسے نظاموں کا مطلب یہ  
تھا کہ حکمران اپنی پسند کے فرد کو اپنی پسند کے عہدے پر فائز کر سکتے تھے اور جلد ہی



بالکل غیر محسوس انداز میں ریاست اور ملک کے فرمانروا اور اس کے مصاحبین کے کرپشن اور دوسرے مسائل جن کا ہم جائزہ لے چکے ہیں کی طرف لے گئے۔

اب اس مسئلے کا حل ایک ایسا نظام یا کئی ایسے نظام ہیں جن سے ایسی بے غرض حکومت جنم لے جس کی حاکمیت مسلمانوں اور امت کے لئے وقف ہو۔ ہم بہت سارے حل جو کہ پیش خدمت ہیں کو مد نظر رکھ کر بحث کا آغاز کر سکتے ہیں۔ اس سے ہمیں صحیح حل متعارف کرانے میں مدد ملے گی۔

### اشتراکیت اور اشتمالیت

اشتراکیت ایک ایسا نظام ہے جو کہ عوام کی خدمت کے لئے مخصوص ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر اشتراکی حکومت حاکمیت کی نہایت خود غرضانہ اور کرپٹ صورت کی ہوا کرتی رہی۔ حسی مبارک کی حکومت اپنے زمانے میں ایک اشتراکی حکومت تھی، اسی طرح الجزری اور صدام حسین کی حکومت بھی۔

اس کی وجہ ریاستی ملکیت کا استعمال ہے۔ ریاست تمام ذرائع پیداوار کی مالک ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو افراد ریاستی نظم و نسق چلاتے ہیں وہ پورے ملک کے مالک ہیں اور آخر کار وہ تمام دولت اور اختیار اپنے مصاحبین کے لئے رکھ لیتے ہیں۔ اشتراکیت بے غرض حکومت کی طرف راہنمائی نہیں کرتی۔

### سرمایہ داریت

یہ ذاتی ملکیت اور منڈی کی معیشت کا نظام ہے۔ اس نظام میں بہت ہی قلیل اختیارات ریاست کے پاس ہوتے ہیں جبکہ جدید ریاست اپنی کچھ شیم بیوروکریسی اور انتظامی مشینری کے ساتھ سرمایہ دارانہ معیشت چلاتی ہے تاکہ چند افراد کو نواز جا سکے۔

منڈی کی معیشت ایک بے غرض حکومت ترتیب دینے کے لئے بہت زیادہ

مددگار ہو سکتی ہے لیکن سیاسی اصلاحات بہت ضروری ہیں۔ سرمایہ داریت ہر حوالے سے صرف چند افراد کو نفع پہنچانے پر مائل رہتی ہے۔ حکومت کو ایسی صورتحال کا تذکرہ کرنا ہوگا۔ صرف ایک بے غرض حکومت ہی منڈی کو اجازت دے سکتی ہے کہ بہت سارے لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ منڈی کو بہر حال بے غرضیت کے ذریعے کنٹرول کرنا ہوگا۔

### جمہوریت

(مغربی جمہوریت) اگر جمہوریت کا مطلب لوگوں کی چنی ہوئی حکومت ہے تو پھر یہ ہمارے لئے معمولی سی قابل استعمال ہے۔ ناصریہ لوگ جن سے حسی مبارک کی حکومت نے جنم لیا اپنی حکومت کے شروع میں بے حد مقبول تھے اور بڑی آسانی سے الیکشن جیت لیتے تھے۔ کئی دوسرے مقامات پر اس طرح کے گروہ نمودار ہوئے مثلاً الجزائر میں جہاں ”قومی محاذ آزادی“ شروع میں غالب اکثریت والی مقبول عام تحریک تھی۔

آج کل مغرب بذات خود مسلم دنیا میں جمہوریت کے حوالے سے بیان بازی کرتا رہتا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حکمران جتھوں پر کئی قسم کا کنٹرول رکھا جائے لیکن یہ صرف ان کے اپنے مفادات کے لئے ہے تاکہ حکمران جتھوں کے ہاتھوں چرائی گئی دولت کو مغرب میں روکا جاسکے۔ جمہوریت سے مغرب کی مراد یہ ہوتی ہے کہ مسلم دنیا میں مغربی طور طریقے رائج کرنے کی آزادی دی جائے اور ایسے افراد کی حاکمیت قائم ہو جنہیں مغرب پسند کرتا ہو۔ اس طرح بے غرض حکومت معرض وجود میں نہیں آئے گی بلکہ مغربی اطوار کے حامل، مغرب کے حمایت یافتہ افراد کی خود غرضانہ حکومت بنے گی۔

جمہوریت کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ حکومتی اختیارات کو محدود کیا جائے۔ شہریوں کو حکمرانوں کے خلاف کئی قسم کے تحفظات حاصل ہوتے ہیں، حکمرانوں کو



لازمًا قانون کا پابند ہونا ہوتا ہے اس طرح کے اقدام بظاہر نفس پرست حکمرانوں کے اختیارات پر بہت بڑی حد اور بے غرض حاکمیت کے لئے حوصلہ افزا ہوتے ہیں۔

لیکن عام مسلمانوں کو وہ حقوق کبھی نہیں دیئے گئے جو مغرب میں جمہوریت دیتی ہے۔ مسلمانوں میں اس کی کوئی تاریخ نہیں، کوئی بھی فرد مسلم دنیا میں موجود مغربی قوانین کی تو قیر نہیں کرتا۔ پس جو کام ہمیں بہر صورت کرنا ہوگا وہ یہ ہے کہ خود اسلام کے اندر ایسے عناصر تلاش کئے جائیں جو مغرب کے جمہوری حقوق سے مشابہت رکھتے ہوں۔ اس کی کلید یہ ہے کہ حکمران شریعت کے پابند ہو جائیں۔ حکومت کو بہر صورت شریعت کا تابع ہو کر بے غرض ہونا ہوگا۔

### اسلام

اس میں دنیا کی کسی بے غرض حکومت کی بنیاد خود اسلام کو ہونا چاہئے۔ لوگ جو اسلام سے متاثر ہیں مسلمانوں اور امت کی خدمت کر سکتے ہیں۔ یہ خود عرض جتھے جہاں کہیں بھی ہیں کسی نہ کسی لحاظ سے اسلام دشمن ہیں۔ سب سے بڑی غداری تو یہ ہے کہ مسلم ممالک کو ان کی کافی زیادہ تعداد مکمل طور پر چھوڑ دینا چاہتی ہے اور اپنی زندگی مغرب میں بسر کرنا چاہتی ہے۔ ان کے سروں پر یہ دھن سوار ہے کہ وہ مغربی معاشرے کی بلندیوں کو سر کرنے والے ہیں۔ وہاں انہیں بہت اچھی نوکریاں دی جائیں گئی اور دوبارہ انہیں کبھی بھی مسلم دنیا میں نہیں جانا پڑے گا اور نہ ہی کسی مسلمان سے ملنا پڑے گا بس مسلم معاشرے کے اعلیٰ طبقے میں جو لوگ ہیں وہ اسی قسم کے ہیں۔ سلمان رشدی اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔

اسلام حاکم اور محکوم کے درمیان رابطہ پیدا کرتا ہے۔ مسلم عوام کی خدمت صرف ایک بے حد مخلص مسلمان کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے جو کہ اس طرح زندگی گزارنا پسند کرے جس طرح کے تمام مسلمان بسر کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کا غلط

استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ جب ان خود غرض جتھوں کی مقبولیت آخری دموں پر ہوتی ہے تو یہ اچانک اسلام پسند بن جاتے ہیں اور سبز جھنڈے لہرانے شروع کر دیتے ہیں۔ غیری نے سوڈان میں ایسے کیا اور ضیاء نے پاکستان میں، صدر سادات نے بھی قتل کئے جانے سے پہلے ایسے ہی کیا تھا اور آج کل صدام حسین ہاتھ کاٹ رہا ہے۔

(کتاب اس وقت لکھی گئی تھی

جب صدام حسین عراق کے سربراہ مملکت تھے)

### جدید اسلامی تحریکیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ اسلامی تحریکیں بے غرض حکومت قائم کرنے میں مخلص ہیں۔ ایرانی حکومت، سوڈانی حکومت، حزب اللہ اور جماعت اسلامی سب کی سب بے غرض حکومت قائم کرنے میں مخلص ہیں تاہم ان تحریکوں کو بھی گہرے مسائل درپیش ہیں۔

خطرہ بالکل واضح ہے کہ کامیابی کے بعد یہ حکومتیں بھی ”قومی محاذ آزادی“ اور ناصر کی حکومت کی طرح خود غرض حکومتیں بن جائیں گی، کیوں کہ ان تحریکوں اور ناکام حکومتوں کے خدو خال ایک جیسے ہیں مثلاً ایک مطلق العنان ریاست اور پارٹی ہونا، معیشت کے حوالے سے اشتراکی انداز اختیار کرنا، جمہوریت کو مسترد کرنا، کرشمے دکھانے والی قیادت کا استعمال اور پولیس اسٹیٹ کی طرف جھکاؤ۔ یہ سب کہتے ہیں کہ شریعت نافذ کریں گے لیکن سب اپنی ہی شریعت بناتے ہیں مگر شریعت کے نفاذ کے حوالے سے اپنے اوپر یا اپنے خلاف کوئی حد قبول نہیں کرتے ہیں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ سعودی حکومت اپنے آغاز میں مسلمانوں کے لیے وقف حکومت تھی اور اب دوسری خود غرض حکومتوں میں شمار ہوتی ہے۔ بہت



سارے لوگوں کا نقطہ نظر ہے کہ اسلامی تحریک محض حصول اقتدار کے لیے چھینا جھپٹی ہے جس سے معاملات بہتر نہیں ہوں گے بلکہ اس کی وجہ سے دوران تحریک بڑی مصیبتیں کھڑی ہوں گی۔

اس سب سے بڑھ کر اسلامی تحریک کو شریعت پر مبنی ایک آئین مرتب کرنا ہوگا۔ آج کل وہ ان کے پاس نہیں ہے۔ لہذا میں اپنے سب سے اہم نتیجے پر پہنچتا ہوں۔ مسئلے کا حل بالکل واضح ہے ”بے غرض حکومت“ لیکن کوئی بھی موجودہ تحریک اس قسم کی بے غرض حکومت کا خاکہ پیش نہیں کرتی اور نہ ہی کوئی موجودہ نظام فکر بے غرض حکومت کا تصور پیش کرتا ہے۔ یہ امر بذات خود مسلمانوں کے لیے بحران کا درجہ رکھتا ہے جس سے باہر آنے کا کوئی راستہ نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی حل۔ سب سے بہترین تجویز ایک اسلامی تحریک ہے۔

لیکن اس صورت میں اگر وہ کامیاب ہو جائے یہ پہلے کا الٹا چکر بھی ہو سکتا ہے جس سے مثالیت پسند اقتدار میں آجائیں جن کی پہلی ہی نسل مستقبل کی کرپٹ ٹولی بن جائے اور ان کی ہر ہر پور کرپشن میں ایسی ڈھنسی ہو جیسے ماضی کے لوگوں کی۔

### مکمل حل:

اب میں اس کا مستقل حل پیش کروں گا۔ یہ ایک باوفا اسلامی حاکمیت کی بالا دستی اور شرعی آئین کے ذریعے مطلق العنان ریاست بننے سے گریز کرے گی۔ اشتراکی معیشت سے پہلو تہی کا کردار محدود کرتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے پسند کی زندگی بسر کرنے کی اجازت دے گی، شدت پسندی اور فرقہ پرستی سے دور رہے گی، امن اور امت کی خاطر حکومت کرے گی۔

میرا خیال ہے کہ تاریخی اعتبار سے ایسی حکومت اسلامی روایات کے عین مطابق ہے۔ روایتی اسلام میں معاشرہ خود مختار ہے، شریعت کو بالا دستی حاصل ہے، علماء

حکومت پر پابندیاں عائد کرتے ہیں اور شریعت تا جرانہ معیشت کی راہنمائی کرتی ہے لیکن اسلام میں موجودہ طرز کی ریاست کا کوئی وجود نہیں یہاں تک کہ نہ فکر میں نہ تحریک کے مقصد کے طور پر، تاہم مسلمان پہلے ہی محسوس کر رہے ہیں کہ ان کا راستہ اسی نوع کی ریاست کی طرف جاتا ہے۔ تمام تر مشکلات کے ہوتے ہوئے گرد و پیش میں ایسی صورتحال وقوع پذیر ہو رہی ہے جس سے کم خود غرض حکومت جنم لے رہی ہے۔

اسلامی تحریک جمہوریت کی مخالفت اور مطلق العنانیت پسندی کو قیمت چکا تے ہوئے کٹھن مرحلوں سے گزر رہی ہے۔ ایران اور سوڈان کو بہر صورت نرمی اختیار کرنی ہوگی۔ ہاشمی حکومت کی دی گئی ڈھیل کے سبب اردن میں میری بیان کردہ تصویر سے ملتی جلتی صورتحال ابھر رہی ہے۔

بوسنیا ایک عمدہ جمہوریت ہوگا اگر کبھی وہ جنگ سے نکل کر بطور ریاست معرض وجود میں آیا، پاکستان برسوں کی فوجی حکمرانی کے بعد اپنے اس سے ملتے جلتے رخ کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ نئی فلسطینی ریاست بھی ہو سکتا ہے ایسی ہی ہو۔ ملیشیا ایک بڑی خود شناس مسلم جمہوریت بنتا جا رہا ہے۔ یہ حکومتیں شعوری طور پر اسلام کی پیروی نہیں کر رہیں لیکن اس سمت چلی جا رہی ہیں۔

مسلم دنیا کی اتنی ساری حکومتوں کے صاف طور پر ناکام ہو جانے سے ہو سکتا ہے کہ وہ مطلق العنانیت سے دست برداری کا راستہ اختیار کریں، جس طرح سویت حکومت یا مشرقی یورپ کی حکومتوں نے کیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عراق، شام اور لیبیا کی حکومتیں بالکل اسی طرح دیوالیہ ہیں جس طرح کی مشرقی یورپ کی حکومتیں دیوالیہ ہو گئی تھیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان جتھوں اور خفیہ پولیس کا زمانہ بیت گیا۔ کسی بھی دن صدام، قذافی یا حافظ اسد جاسکتے ہیں۔

کسی طرح بھی ہو سکتا ہے کہ کم خود غرض حکومتیں قائم ہوں۔ جس امر کی



ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ایک حقیقی اسلامی بے غرض حکومت کے لیے شعوری جستجو کی جائے اور ایک مناسب نظریہ مرتب کیا جائے۔ اگر بے غرض حکومتیں اقتدار میں آتی ہیں تو مسائل فوراً حل ہو جائیں گے۔ اگر صرف چار پانچ موجودہ مسلم ریاستیں متحد ہو جاتی ہیں یا اکٹھے کام کرتی ہیں بطور ایک جان دو قالب تو ایک ایسی ریاست جنم لے گی جو برطانیہ سے زیادہ طاقتور ہوگی۔ اگر مسلم دنیا کی ڈھیروں دولت ان مختلف ملکوں کی عوام کو لونا دی جائے تو بھاری بھر کم معاشی اور سماجی مسئلے فوراً ختم ہو جائیں گے۔ اگر مسلمان آزاد ہو جائیں تو ذہین مردوں اور عورتوں کی بے پناہ تخلیقی سرگرمی پھلے پھولے گی اور ایک خوبصورت آرٹ اور کلچر پیدا ہوگا، ایک بہت بڑی معیشت ابھرے گی۔

ہمیں غم زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کا معاشرہ قبائلی ہے اور قبائلی سیاستدان پر حکومت کرتے ہیں لیکن اسلام بذات خود پھل پھول رہا ہے۔ وہاں کبھی بھی اتنے مسلمان، مسجدیں اور حاجی نہیں تھے۔ امت کی ایک اپنی زندگی ہے جو اس سب کچھ کے باوجود پوری شان سے جاری و ساری ہے۔ اگر دوسرے تمام حل ناکام ہو جاتے ہیں تو روایتی اسلامی حل یہ ہے کہ مسلمان لازماً معاشرے کے اندر ایک جزیہ بنالیں اور اس جزیے پر ایسی بہترین زندگیاں بسر کریں جتنی کہ وہ کر سکتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اب کوئی بھی اسلام پر اسی طرح حملہ نہیں کرتا جیسا کہ اتارک اور اشتہالیوں نے ۱۹۲۰ء کی دہائی میں کیا تھا۔ ان قبائلی حملوں میں سے شہر خود مسلمان حکمرانوں نے کیے۔ اور اب مسلمان اس انداز میں واپسی کی لڑ رہے ہیں جو وہ چند سال پہلے نہیں لڑے تھے۔ اب مسلمان جانتے ہیں کہ ان کے دشمن غلط ہیں۔ اسلام ان تمام کمیونسٹ سرزمینوں سے جہاں وہ مردہ ہو چکا تھا دوبارہ زندہ ہو رہا ہے۔ ہم سب کو جس امر کی ضرورت ہے

وہ ہے قومی تحریکیں اور راہنما جو مسلمانوں اور امت کو فوقیت دیں اور ایک بے غرض حکومت قائم کریں۔ ہر چیز جلد بہتر ہو جائے گی۔ مسلمان زندہ رہ سکتے ہیں چاہے معاشرے میں ایک جزیے کے طور پر ہی رہیں۔

### لب لباب:

مسئلہ جو مسلمانوں کو درپیش ہے یہ ہے کہ زیادہ تر مسلم ریاستوں کے حکمران خود غرض ہیں۔ اس کا حل بے غرض حکومت کا قیام ہے۔ آجکل ایسی بے غرض حکومت افکار کی دنیا میں بھی شاد ہی ملتی ہے کجا کہ سیاسی تحریک کے طور پر یا عملی طور پر موجود ہو۔ لیکن شاید یہ حل اسکا لرز نہیں ڈھونڈ پائیں گے اور نہ ہی سیاستدان، اس کا حل بھی عوام خود تلاش کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جو کہ ایک مقدس حل ہے اور جب میل جائے گا تو ایک نیا عہد طلوع ہوگا۔



## اللہ واحد کی حاکمیت اور استبدادیت

گزشتہ باب میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ صرف قدیم اسلام ہی اللہ واحد کی حاکمیت قائم کرتا ہے۔ اس باب کا مقصد اس امر کی وضاحت ہے کہ قدیم اسلام برے حکمرانوں اور جابروں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا تھا اور اس امر کو کیسے یقینی بنایا جاتا تھا کہ حکومت اچھی ہوگی۔ اس باب میں ہم یہ وضاحت کریں گے کہ بڑے حکمران اور عہدے دار کیسے اپنے عہدوں سے برطرف کیے جاتے ہیں اور کس طرح حکومت کا دائرہ کار محدود کیا جاتا ہے۔ حکومت کو کیسے کنٹرول میں رکھا جاتا ہے، اسے پابند بنایا جاتا ہے کہ اچھے کردار کو یقینی بنائے۔

اس باب کو رقم کرنے کی دو وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ قدیم اسلام کے نظریات کی احیاء کی جائے تاکہ دنیا میں پھر ایک بار اللہ واحد کی حکمرانی قائم کی جائے۔ دوسری وجہ قدیم اسلام پر باندھے گئے ایک بڑے بہتان کا جواب دینا ہے۔ وہ بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلامی حکومت نا اہل ہے اور یہ ہمیشہ ہی نا اہل تھی۔ یہ درحقیقت مشرقی استبدادیت ہے۔

یہ باب اس جھوٹ کے ساتھ اختلاف یہ جھوٹ کرے گا۔ تقریباً ہر اس مصنف نے بولا ہے جس نے اسلام پر لکھا ہے۔ ان کے بقول واجب ہے کہ حکمران کی فرمانبرداری کیجائے چاہے وہ کتنا ہی نا اہل کیوں نہ ہو۔ مسلمان بادشاہ پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کے جور و جبر پر کسی قسم کی کوئی پابندی یا فریاد کی گنجائش! بادشاہ زمین پر ظل الہی ہے اور بادشاہ کی حکم عدولی اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ صاحب اقتدار افراد کے تابع فرمان رہیں۔ ایک دن بغیر حکمران گزارنے سے بہتر ہے کہ سو سال ظلم کے

سائے تلے جی لیا جائے۔ کوئی بھی ظلم اس بات کا جواز فراہم نہیں کر سکتا کہ بادشاہ کو اپنے منصب سے ہٹا دیا جائے۔

اب چونکہ مسلمانوں کو شاہ وقت کے خلاف بغاوت کی اجازت نہیں۔ لہذا مسلمان حکومتیں بقول ان کے ہمیشہ سے ہی جابرانہ رہی ہیں اور مسلمانوں پر ظلم روا رکھتی رہی ہیں، بادشاہوں کی دیوتاؤں کی طرح پوجا کی جاتی تھی اور وہ کسی بھی فرد کے خلاف خواہ وہ ان کی رعایا ہو یا کوئی منصب دار ٹھیک وہی کچھ کر سکتے تھے جو وہ پسند کرتے قطع نظر اس کے کہ وہ کون ہے۔ بادشاہ رعایا سے مکمل طور پر الگ تھلگ اپنے محل میں تشریف فرما رہتا اس انداز میں کہ کوئی بھی ایسا شخص اس کے قریب نہ بھٹکے جو اسے بتا دے کہ رعایا اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے اور اس سے کیا توقع رکھتی ہے۔

مسلمان محض ہاتھوں پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھے رہتے تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ تقدیر پرست تھے اور تسلیم کرتے تھے کہ تمام مصیبتیں زندگی کے سبب نازل ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے بقول ان جھوٹوں کے بہت پہلے اچھی حکومت قائم کرنے کے لئے کوشش کی تھی لیکن ناکامیاب رہے تھے اور اب وہ کلیتہاً پسند ہو گئے تھے۔ اچھی حکومت کے خیال سے بھی دور، اس زندگی میں اچھی حکمرانی سے مایوس دنیا سے بیزار، محض بے حس و حرکت تماشا دیکھ رہے ہیں جبکہ ان کے حکمران ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

چونکہ مسلمان حکومت اپنی فطرت کے اعتبار سے نا اہل اور حقیقت میں مشرقی استبدادیت تھی۔ لہذا مغربی ممالک کی اچھی حکومتوں سے کم تر تھی جو کہ ہمیشہ اپنی عوام کا خیال رکھتی تھی لہذا مغربی تہذیب مکمل طور پر اسلامی تہذیب سے برتر ہے کیوں کہ مغرب میں مشرقی استبدادیت نہیں ہے۔

لیکن یہ مشرقی استبدادیت ابھی تک ہمارے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ آپ



دیکھتے ہیں بقول ان جھوٹوں کے مسلمانوں کے ہاں اچھی حکومت کی کوئی روایت نہیں اور وہ بادشاہ کے فرمانبردار ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ کتنے برے ہیں۔ مسلمان آج بھی یہی کچھ کرتے آرہے ہیں اور یہ اس سبب سے ہے کہ مسلم دنیا پر صدام، مبارک، اسد اور خمینی جیسے بربریت پسندوں کی حکومت ہے۔ مسلمان کبھی اس چیز سے باخبر نہیں رہے اور وہ کبھی باخبر نہیں ہوں گے کہ ایسی حکومت کس طرح قائم کی جائے کہ جسے اچھا کہا جاسکے۔ عام مسلمان حکومتیں بربریت پرور ہیں لہذا مسلمان نا اہل ہیں کہ وہ اپنے اوپر حکومت کریں لہذا ان کے لئے بہتر ہے کہ مغرب ان پر حکومت کرے یا پھر مغربی انداز فکر کے حامل افراد۔

اس جھوٹ کی تشخیص یوں کی جاسکتی ہے کہ جفاکاری عین اسلامی فعل ہے۔ روایتی اسلام مسلمانوں کی جان اور جائیداد کو ایسے فرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے جو محض اتفاقات زمانہ سے اقتدار میں آگیا۔ ایک جفاکار بادشاہ مسلمانوں کو لوٹ بھی سکتا ہے اور ان پر ظلم بھی ڈھا سکتا ہے، لیکن اسلام انہیں کبھی ایک لفظ نہیں کہتا۔ تمام بادشاہ کے سامنے بے بس ہیں، تمام بہرے ہیں، مسلمان محض غلام ہیں۔ اسلام انہیں یہ حکم دے کر پختہ تر غلام بناتا ہے کہ وہ ہر قیمت پر شاہ کی فرمانبرداری کریں اس لحاظ سے آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اسلام سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔

یہ بہتان اسلامی تہذیب کی قدر کو مکمل طور پر گھٹا دیتا ہے۔ کس طرح ایک تہذیب عظیم ہو سکتی ہے جبکہ وہ استبدادیت کا خیر مقدم بھی کرتی ہو؟ اس کی تہذیب صرف غلامی ہی ہوگی لیکن یہ بہتان بد قسمتی سے اسلامی حکومت پر لکھی جانے والی تمام کتابوں میں پایا جاتا ہے، اس پر بھرپور ایمان ہے اور مسلم دنیا کی موجودہ صورتحال کی وضاحت کے لئے اس بات کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔

درحقیقت یہ خیالات سراپا جھوٹ ہیں۔ روایتی اسلام استبدادیت کو رد کئے

کے لئے بادشاہ کے اختیارات کو محدود کر دیتا ہے اور حکومتی اختیار کو محدود کر کے اس پر کنٹرول رکھتا ہے۔ یہ بہتان انتہائی نامعقول ہے لیکن جب ہم اس حقیقت کو بیان کریں گے تو اللہ واحد کی حاکمیت اور قدیم اسلام کے حوالے سے بہت سی آگاہی حاصل کریں گے۔ سب سے پہلے تو کوئی بھی شخص جسے مسلمان کہلوانے سے روک دیا جاتا ہے خود بخود حکمران بننے سے بھی روک دیا جاتا ہے۔ کوئی بھی سلطان جو کفر اختیار کر لیتا ہے پہلے ہی لمحے اختیارات کھو بیٹھتا ہے اور کوئی بھی حکمران جو نماز کی ادائیگی پر روک لگاتا ہے اسے جہاد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا ایک مسلمان بادشاہ کا کردار عنان اقتدار سنبھالتے ہی ایک معاہدے کے ذریعے محدود کر دیا جاتا ہے۔ جب پہلا حکمران رخصت ہوتا ہے تو نیا حکمران معاشرے کے عمائدین کے ذریعے منتخب ہوتا ہے اور اس کی توثیق ایک عہد وفاداری کے ذریعے کی جاتی ہے جسے بیعت کا نام دیا جاتا ہے۔ جس وقت بیعت دی جاتی ہے عین اس وقت حکمران پر کئی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں مثال کے طور پر ہو سکتا ہے کہ اس سے عہد لیا جائے کہ وہ کس قسم کا ٹیکس وصول کرے گا اور کونسے راہنما اصولوں کی پیروی کرے گا۔ عہد وفاداری ان شرائط کے ساتھ مشروط ہوگا جن کی تعمیل کی جانی ہوگی۔

تیسرا کوئی بھی بادشاہ برطرف کیا جاسکتا ہے اگر وہ مزید حکمرانی کرنے کے لائق نہ ہو۔ شرعی لحاظ سے کسی بھی بادشاہ کو تسلیم کئے جانے سے روکا جاسکتا ہے اگر وہ امن و امان اور اچھے نظم و نسق کی مزید ضمانت نہیں دے سکتا جس کی حفاظت کے لئے اسے منتخب کیا گیا تھا۔ حکمران خود کو بھی حکمرانی کے لئے نا اہل قرار دے سکتا ہے اور امن عامہ کی ضمانت نہ دینے پر اسے برطرف بھی کیا جاسکتا ہے۔ ایک جابر حکمران سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے اگر اس کی پالیسیاں اس کے منصب کا دلائع کرنے سے قاصر ہوں اور انتشار کا سبب ہوں۔



ایک حکمران کا بایکاٹ بھی کیا جاسکتا ہے اور اسے اپنے خراب کردار کے حوالے تلقین بھی کی جاسکتی ہے۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ عمدہ اخلاق کا حامل ہو اور ایسا نہ ہو تو اسے آگاہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب ایک بڑا عام سا سوال اٹھتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کا اختیار کس شخص کو حاصل ہے جو بیعت دے، شرائط عائد کرے، نا اہل کا اعلان کرے اور تنقید کرے۔ اس سوال کا جواب ہمیں اصل رکاوٹ تک لے آتا ہے جو کہ اسلام نے استبدادیت پر عائد کی ہے۔

حکمرانوں کے طرز عمل اور ان کے اختیارات کی حد بندی علماء کرتے تھے۔ وہ علماء اسلامی علوم کے ماہر تھے۔ ہر اسلامی حکومت میں وہ ایک گروہ بناتے تھے، سرکردہ علماء ایک گروہ کے طور پر کام کرتے ہوئے حکمرانوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے مرکزی سیاسی کردار ادا کر رہے تھے۔

بیعت دینے میں علماء کی حیثیت ایک بنیادی گروہ کی تھی اور یہ علماء ہی تھے جو حکمرانوں کو حکومت کرنے کا قانونی حق تفویض کرتے تھے، یہ علماء ہی تھے جو کسی حکمران کے تقرر اور اس کی برطرفی کا بندوبست کرتے اور وہ علماء ہی تھے جو اپنے فتوؤں سے ایک حکمران کو غیر موثر بناتے ہوئے اقتدار سے الگ کر دیتے۔ علماء کو یہ بھی حق حاصل تھا کہ وہ حکمرانوں پر تنقید کریں اور اس سے قطع تعلق کر لیں۔

وہ یہ سب کچھ کرنے کے مکمل اہل تھے۔ عثمانی عہد کے علماء نے عثمانی سلطان کو برطرف کیا۔ علماء صوبوں کے گورنر بدل سکتے تھے اور کسی ماتحت افسر کو برطرف کر سکتے تھے۔ اسلام میں یہ فرض ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔ یہ علماء تھے جو یہ کام مکمل طور پر کرتے تھے، سرکردہ علماء اپنے فتوؤں کے ذریعے حکمران کو بطور حاکم کام کرنے سے روک دیتے یا پھر کام کرنے کی اجازت دیتے۔ مراکش میں اٹھارویں صدی کے شروع میں یورپیوں کے حملہ آور ہونے کا خدشہ تھا۔ علماء نے فتوؤں کے ذریعے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ عوام میں

اسلحہ تقسیم کرے حالانکہ اپنے مخالفوں میں اسلحہ تقسیم کرنے سے خود سلطان کی گرفت کمزور ہوتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے ابتدائی زمانے میں قاہرہ کے علماء نے مملوکوں کو غیر اسلامی ٹیکس وصول کرنے سے روک دیا تھا۔ 1907ء میں مراکش کے علماء نے سلطان کو برطرف کر کے اس کی جگہ اس کے بھائی کو تخت نشین کر دیا کیوں کہ سلطان نے فرانسیسی دستوں کو اجازت دی تھی کہ وہ کاہنوں کے سامنے پڑاؤ ڈالے لہذا وہ کفر کے مقابلے میں اسلام کا دفاع کرنے میں نا کام ہو گیا تھا۔

تمام اہم سیاسی کھینچا تانی میں علماء نے ریفری کا کردار نبھایا، کوئی بحران پیدا ہو جاتا تو وہ ثالثی کرتے اور جھگڑے کا تصفیہ کراتے۔ پس سلطان علماء کو قریب رکھ کر حکمرانی کرتے۔ عام طور پر کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل سلطان علماء سے مشاورت کرتا۔ ملک کے تمام سرکردہ سیاسی گروہوں کے ساتھ علماء کے قریبی روابط ہوتے اکثر دوستی اور شادی بیاہ کے حوالے سے۔

علماء بادشاہ کو بہت سارے انتظامی افسر بھی فراہم کرتے اور اس طرح یہ امر یقینی بنایا جاتا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود رہیں۔ علماء کرپٹ انتظامی افسروں کی جواب طلبی کرتے، علماء بطور سفیر بھی کام کرتے، میدان جنگ میں بھی علماء افواج کے ساتھ ہوتے تاکہ اس امت کا مشاہدہ کر سکیں کہ افواج کا کردار درست ہے۔ علماء عموماً ٹیکس وصول کرنے والے عملداروں کے ہمراہ بھی ہوتے۔

بلاشبہ علماء تمام عدالتی عملہ فراہم کرتے، تمام جج اور وکلاء علماء ہی ہوتے تھے، تمام قانونی کاروبار اور تجارتی کاروبار خواہ وہ ذاتی ہو یا حکومتی علماء ہی چلاتے تھے۔ علماء حکومتی رسوخ سے بالاتر ہوتے، ان کی اطاعت شریعت کے لئے تھی جو کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے نہ کہ بادشاہ کے لئے۔ اگر علماء حکومتی رسوخ سے بالاتر رہتے تو انہیں نیک نامی ملتی۔ ایک عالم کے لئے سب سے بڑی تعریف یہ تھی کہ



اس نے حکومتی منصب سے خود کو آلودہ نہیں کیا۔ ایک عالم بادشاہ کے جس قدر قریب ہوتا اس کی شہرت کو بٹا لگنے کا خدشہ رہتا۔ سب سے بڑھ کر ایک عالم کی رکنیت کی بنیاد اس کی عزت، دانائی، علم اور اس کا کردار ہوتا۔

اسلام میں علماء پیغمبر ﷺ کے وارث ہیں، یہ بادشاہ سے بھی افضل ہیں۔ مسلمانوں کے اصل راہنما علماء ہیں نہ کہ سلطان۔ علماء اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ حاکمیت اللہ بادشاہ کی ہے۔ علماء عام مسلمانوں کے جملہ نمائندوں سے افضل ہیں۔ اسلام عوام سے محبت کرتا ہے اور علماء کی جڑیں عوام میں بہت گہری ہوتی ہیں۔ عوام علماء سے محبت کرتے ہیں۔ قاہرہ میں عوام وہی کچھ کرتے ہیں جو علماء انہیں کہتے ہیں۔

بلاشبہ علماء میں مشائخ بھی شامل ہیں اور علماء صوفی سلسلوں کے رکن ہیں، وہ اس بات کا زبانی اظہار کرتے ہیں اور ان کی تائید سے خوش ہوتے ہیں۔ مغرب کی آمد سے پہلے مسلمان معاشرے میں ہر تین میں سے دو افراد ان صوفی سلسلوں سے منسلک ہوتے تھے۔ اتنی بڑی مقبول عام تائید کا مطلب یہ ہے کہ علماء اور کچھ صوفی شیخ بھر پور اعتماد کے ساتھ بادشاہ سے بات کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی بادشاہ علماء سے زیادہ دیر تک نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

اسلام اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کردار علماء سے وابستہ ہے۔ طبقہ علماء ایک ایسا مراعات یافتہ طبقہ ہے جس پر نہ ہی ظلم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی انہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے جبکہ وہ کسی بھی بادشاہ کے بے خوف نقاد کے طور پر کام کر سکتے ہیں۔ بلکہ یہاں حکومت پر ایک اور پابندی بھی ہے۔

جدید مغربی ریاست میں حکومت معاشرے کے ہر حصے میں مداخلت کرتی ہے۔ وہ چاہے تو کوئی بھی قانون بنا سکتی ہے اور کسی بھی چیز میں مداخلت کر سکتی ہے۔ وہاں کچھ بھی اس کے دائرہ کار سے باہر نہیں ہے۔ اسے عرف عام میں

حکومت کا اقتدار اعلیٰ کہا جاتا ہے۔

تاہم مسلمان بادشاہ کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہے۔ وہ کوئی قانون نہیں بنا سکتا کیونکہ شریعت اس سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ چونکہ شریعت جامع ہے لہذا اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔

ایک بار پھر نہایت اہم بات کہ شریعت کی تشریح کا اختیار علماء کے ہاتھ میں ہے۔ برطانوی حکومت اپنی بنائی ہوئی کسی شق کو پارلیمنٹ میں لا کر قانون بنا سکتی ہے، مسلم سلطان ایسا نہیں کر سکتا۔ شریعت اس سے بالا ہے اور صرف علماء ہی اسے بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سا کام قانونی اعتبار سے کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا۔

معاشرتی سرگرمیوں کا کافی بڑا دائرہ ایسا ہے جسے حکومت چھو نہیں سکتی۔ پورا تعلیمی نظام علماء چلاتے تھے، تعلیم پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں تھا، عوامی بہبود اور سماجی تحفظ کے نظام علماء اور صوفی سلاسل چلاتے تھے، تعلیم اور بہبود کے مالیاتی معاملات ریاست کی دسترس سے باہر تھے، یہ زکوٰۃ اور عطیات کے وقف نظام پر مشتمل ہوتے تھے جو ریاست کی پہنچ سے باہر تھے۔ اٹھارویں صدی میں تقریباً بیس فیصد زمین وقف میں داخل ہوئی تھی جس کا پٹہ اور آمدنی تعلیم اور بہبود کے شعبوں کی مالی معاونت کے لئے استعمال کی جاتی تھی، اور بلاشبہ عدالتی نظام پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں تھا، بلکہ یہ علماء کے ہاتھ میں تھا۔

شاید سب سے اہم بات یہ ہے کہ نظریہ سازی اور نظریاتی پرچار میں حکمران کی کوئی گنجائش نہیں۔ جدید ریاست یہ بتاتی ہے کہ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کو کیا پڑھانا ہے، وہ اخباروں اور نشریاتی اداروں پر ریاستی کنٹرول کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں کو کنٹرول میں رکھتی ہے۔ نظریات ریاست کے کنٹرول میں ہیں یہاں تک کہ جمہوری برطانیہ میں بھی۔ یہ مسلم دنیا میں مغرب کی آمد سے پہلے نظریات علماء اور صوفی مشائخ کے کنٹرول میں تھے جو کہ تعلیم کو بھی کنٹرول کرتے تھے اور



نظر یہ سازی بھی کرتے تھے۔

کاروبار اور تجارت کی دنیا شاہانہ عمل دخل سے آزاد قائم رہتی، کاروباری لین دین قانون کے ماتحت ہوتا جسے علماء اور شریعت کنٹرول کرتی۔ حکمران کاروباری افراد پر ٹیکس عائد کر سکتے ہیں وہ انہیں اس بات پر مجبور نہیں کر سکتے کہ ان کی مرضی کے مطابق کاروبار کریں، ذاتی جائیداد کی سچی آزادی ہے۔

اس سب کچھ کا مطلب یہ ہوا کہ حکمران اگر چہ نااہل اور جابر ہی کیوں نہ ہو اسے زندگی کے بہت سارے پہلوؤں پر اختیار ہی نہیں۔ اس نئے زمانے سے پہلے کوئی مسلمان بادشاہ ایسا کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا جو کچھ انہوں نے کیا۔ مسلم دنیا میں اس طرز کی کوئی ریاست نہیں جس کا خیال مغربی ریاست جیسا ہو۔ حکمرانوں کا اصل کام فوج اور پولیس منظم کرنا تھا یا پھر ٹیکس اور انتظامی امور ان سے متعلق تھے، ان کے علاوہ کوئی بھی چیز حکمرانوں کے ہاتھ میں نہیں تھی۔

پس استبدادیت پر اصل روک معاشرہ کا تھا جو کہ حکمران سے مکمل طور پر آزاد تھا اور حکمران کی ضرورت محسوس کئے بغیر اور اس کی توجہ سے بے نیاز اپنی زندگی قائم رکھتا تھا۔ معاشرہ درحقیقت آزادانہ طور پر موجود ہوتا تھا اور اس کے پاس علماء اور صوفی مشائخ راہنما کے طور پر موجود تھے۔

پس علماء حکمران کو لگا کر سکتے تھے اور ان پر اثر انداز ہو سکتے تھے، وہ ان کا دائرہ کار بہت زیادہ محدود کر دیتے تھے اور مستقبل کے حکمران جب وہ بچے ہوتے تو علماء ہی انہیں تعلیم دیتے۔

ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہئے کہ بادشاہ کے فوجی اور پولیس والے اختیارات چند بڑے قصبوں سے آگے نہیں ہوتے تھے۔ دیہاتوں میں سرے سے سلطان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا بلکہ یہ ایک خود کار معاشرہ قیادت سے ملتا جلتا۔ ان میں سے بہت سے قبائل خانہ بدوش تھے اور اگر سلطان ان پر جبر کرنے کی

کوشش کرتا تو وہ بڑے آرام سے ایک صحرا سے دوسرے صحرا میں ہجرت کر جاتے۔

ہم نے ساری گفتگو استبدادیت پر لگائی جانے والی حدوں پر کی ہے اور اس کا ہدف صرف حکمران تھے لیکن مسلم معاشرے کو اصل خطرہ علماء اور صوفی مشائخ سے لاحق ہوتا ہے جو کہ بہت زیادہ طاقتور بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ قدیم اسلام علماء اور مشائخ کو براہ راست حکومت کرنے سے روکتا ہے پس علماء اور اولیاء کی طاقت کا اصل مدار ان کی شہرت پر ہوتا ہے، ان کی طاقت حقیقی مشاورت تھی کیوں کہ علماء اور اولیاء کے پیچھے کوئی حکومتی مشینری نہیں تھی۔

مغرب میں جدید ریاست نے ہمیشہ طبقاتی مفادات کی نمائندگی کی ہے، سرمایہ داروں اور مزدوروں جیسے طبقات نے اس چیز سے ریاست کو بے پناہ اختیارات دے دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لاکھوں لوگوں کو اپنے پیچھے چلنے کے لئے، لڑنے کے لئے اور فرمانبردار رہنے کا حکم دے سکتی ہے لیکن مسلمان سلطان کی کوئی طبقاتی بنیاد نہیں ہے۔ معاشرہ اور معاشرتی طبقات علماء اور اولیاء کی پیروی کرتے ہیں نہ کہ سلطان کی۔

اس طبقاتی بنیاد کے فقدان کے باعث عموماً مسلمان حکومت معاشرے سے بالکل دور کھڑی نظر آتی ہے۔ اپنے اختیارات کے حوالے سے سلطان کو اپنی سپاہ پر بھروسہ ہوتا تھا جنہیں خصوصی طور پر بھرتی کیا جاتا تھا، ان سپاہیوں کو مقامی آبادی سے دور رکھا جاتا تھا اس خوف سے کہ وہ بھاگ جائیں گے۔

مغربی دانشوروں نے اسے استبدادیت کے حصے کے طور پر دیکھا کہ حکمران کا ان لوگوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہوتا تھا جن پر وہ حکومت کرتا تھا لیکن یہ استبدادیت کے عدم موجود ہونے کا ثبوت ہے۔ حکومت اس قدر غیر اہم تھی کہ وہ اصل معاشرے سے دور الگ کھڑی ہوتی تھی۔ حکومت تنہا تھی جسے خود معاشرے



نے گھیرا ہوا تھا اور وہ مدد کے لئے عوام کو طلب نہیں کر سکتی تھی۔ عوامی مدد علماء اور اولیاء کے ہاتھ میں تھی۔ علماء اور اولیاء معاشرتی طبقات سے بالاتر تھے لیکن قائد ہونے کے سبب ہر امیر اور غریب ان پر ایک جیسا اعتماد کرتا تھا۔ درحقیقت ان کی عوام کے اندر گہری جڑیں تھیں، وہ عوام کی قیادت کرتے اور کسی بھی جابر حکومت سے ہونے والی کشمکش میں ان کی نمائندگی کرتے۔

مسلم معاشرہ اس نوع کے طبقات سے بالاتر ہے جو کہ مغربی معاشرے میں موجود ہیں۔ وہاں امیر اور دولت مند لوگ بھی ہیں لیکن وہ معاشرے کے عمائدین میں سے نہیں، قائد علماء ہی ہیں۔ امیر اور غریب معاشرے کا حصہ ہیں لیکن مخالف طبقہ کے طور پر نہیں بلکہ مختلف گھروں کے اراکین کے طور پر جیسے قبیلہ، ذات برادری اور معیشت کے حوالے سے گروہ ہوں۔

حکمران کسی طبقے کا آلہ کار نہیں ہے جس طرح کہ مغرب میں ریاست ہے لیکن وہ پولیس اور فوج کا سپہ سالار ہے اور یہ استبدادیت پر ایک بہت بڑی روک ہے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ قدیم اسلام میں حکمران کو ہر طرف سے محدود کر دیا گیا ہے، اس سے جان چھڑائی جاسکتی ہے، اس پر سخت قسم کے قانون لاگو کئے جاسکتے ہیں، اسے پابندیوں کے کڑی جال میں پھنسایا جاسکتا ہے جو کہ اس کے اختیارات اور اس کے دائرہ کار کو محدود کر دیتا ہے۔ ہم صاف صاف دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کہنا کہ اسلام استبدادیت پسند ہے کتنا بڑا بہتان ہے۔

اس مسئلے میں اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا گیا اور اتنے وسیع پیمانے پر اسے کیوں مان لیا گیا؟ جب ہم اس کا جواب دیں گے تو قدیم اسلام کے بارے میں اہمیت زیادہ آگاہی حاصل کریں گے۔

سب سے پہلے تو مغربی دانشوروں کو اس بات کی کوئی سوچہ بوجھ نہیں کہ مسلم سیاست کس طرح کام کرتی ہے۔ انہوں نے سیاست پر مسلمانوں کی کتابیں

پڑھی ہیں، ان کتابوں میں انہوں نے ”سزائیں“ ملاحظہ کی ہیں جو کہ بغاوت کرنے یا حکمران پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کے حق کی نفی کرتی ہیں۔ یہ سزائیں مسلمانوں کے سیاسی نظریے کا محض ایک حصہ ہیں لیکن مغربی دانشوروں نے ان پر چند سزاؤں کو پورے کا پورا نظریہ سمجھ لیا ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی نظریے میں بغاوت کرنے والوں کے لئے وعیدیں ہیں۔ قدیم اسلام جس بات سے منع کر رہا تھا وہ حکومتی اختیارات کو محدود کرنا نہیں تھا بلکہ خارجیت اور معیشت پر روک لگانا تھا۔

اسلام کے آغاز میں خارجیوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بغاوت کی، ان کا عقیدہ تھا کہ وہ کسی وقت کسی بھی حکمران کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں اور وہ کسی بھی حوالے سے مثال نہیں۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہیں حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی حکمران کی نااہلی کا فیصلہ سنائیں اور اسے برطرف کر دیں۔ اب خارجیت کا نظریہ کسی بھی حکومت یا حکمران کی طرف ہرگز راہنمائی نہیں کرتا تھا بلکہ یہ ایک قسم کی لاقانونیت تھی اور اس کی جڑیں آزاد روی اور صحرائی بدوانہ لاقانونیت میں پیوست تھیں جو کہ انتہائی شدید قسم کے آزادی پسند قبائلی تھے اور لمبے عرصے تک کسی بھی راہنما کے پیچھے نہیں چل سکتے تھے۔

واقعی اسلام سلطان کو ہر طرف کرنے کی اجازت دیتا ہے جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں لیکن یہ اختیار ہر فرد کو حاصل نہیں اور نہ ہی صرف اس وجہ سے کہ اس کا کردار اچھا نہیں ہے۔ علماء ہی وہ طبقہ ہے جسے ایسا کرنے کا اختیار حاصل ہے اور صرف وہی نہایت احتیاط کے ساتھ بدکرداری کی تعریف کر سکتے ہیں۔

شیعہ ازم میں تو ہر اس شخص سے چھکارا حاصل کیا جانا چاہئے جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرف دار نہیں اور جو براہ راست اللہ کی طرف سے نامزد امام نہیں پس وہ ہر اس سلطان سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے جو کہ حضرت علی رضی



اللہ تعالیٰ عنہ کا اعلیٰ قسم کا طرف دار نہیں ہوتا تھا۔ قدیم اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور مسلم بادشاہ کی شیعوں کے ہاتھوں طرہی کا دفاع کرتا ہے، یہ استبدادیت کا دفاع نہیں ہے، یہ شیعہ مدعیوں کے خلاف مسلمان بادشاہ کا دفاع ہے۔  
دوم: مغربی دانشور اس وجہ سے تذبذب کا شکار ہوئے کہ بعض مسلم حکمران واقعی ایسے تھے جنہوں نے اپنے لئے مکمل اور غیر مشروط اطاعت کا دعویٰ کیا۔ یہ کوئی روایتی اسلامی راہنما نہیں تھے، کئی قسموں کے تھے۔ شیعہ امام جو کہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے نامزد تھے اور تنقید سے بالاتر تھے علماء اس زندہ اسماعیلی امام کے ماتحت تھے۔ اثنا عشری شیعہ ازم میں علماء خود شریعت پر (بذریعہ اجتہاد) اور عام مومن پر مطلق اختیار رکھتے تھے۔ (وہ تمام آیت اللہ ہیں) وہ تمام افراد جو مہدی ہونے کے دعویدار ہیں انہیں ہر چیز پر مطلق اختیار حاصل ہے۔ کسی امام، مہدی، یا آیت اللہ کے خلاف سرتابی کا اختیار نہ کسی کو ہو سکتا تھا نہ ہے۔ اس طرح کے حکمرانوں پر واحد پابندی اپنے دعوے کو عوام سے تسلیم کرانا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لازماً اچھے کردار کا مظاہرہ کریں گے اور ایک بدنام مکروہ افعال کے مرتکب زندہ امام پر زیادہ دیر تک ایمان نہیں رکھا جائے گا۔  
مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے حکمران گزرے ہیں جنہوں نے اس نوع کے دعوے کئے ہیں اور انہوں نے اس قسم کے دعوؤں سے ایرانی شہنشاہیت، منگول قبائلیت اور دوسرے مطلق العنان سیاسی نظریوں کو تقویت دی ہے۔ اکثر اوقات اس قسم کے دعوے غیر مسلم آبادی کو متاثر کرنے کے لئے کیئے جاتے تھے جو مثال کے طور پر صرف ایرانی بادشاہوں ایسے دعوے کرنے والے حکمرانوں کی فرمانبرداری کرتے تھے۔

قدیم اسلام ہر حوالے سے اس قسم کے سلطانوں کی مخالفت کرتا تھا۔ قدیم اسلام نے ان حکمرانوں کے اختیار کو محدود کرنے اور ان پر پابندیاں عائد کرنے

کی بھرپور کوشش کی جو ایرانی بادشاہوں جیسے حد سے متجاوز دعوے کرتے تھے۔ ہم ان حدوں کا ذکر کر چکے ہیں جو قدیم اسلام نے حکمرانوں پر عائد کی ہیں۔ یہ قدیم اسلام شرعی آئین سازی ہے۔ یہ پورا آئین اس لئے مرتب کیا گیا تھا کہ شیعہ اور اس قسم کے دوسرے دعوے کرنے والے حکمرانوں پر حد اور روک لگائی جائے۔ اسلام کی تاریخ اس قسم کے مطلق العنان نظاموں کے اختیارات محدود کرنے کی تاریخ ہے۔ مغربی دانشور اس بات سے بے خبر تھے اور سمجھتے تھے کہ ایرانی بادشاہت سے ملتے جلتے جتنے جتنے حوالے اسلام کا پورا سیاسی نظام ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایسے قلم کاروں نے واقعی لکھا تھا کہ ان برے حکمرانوں کو تسلیم کرو خواہ اس کی کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے لیکن یہ استبدادیت کا قبول کیا جانا نہیں تھا بلکہ یہ اس منصوبے کا حصہ تھا کہ شریعت کو بطور آئین نافذ کیا جائے۔ یہ صرف اس صورت میں سمجھا جاسکتا ہے اگر ہم اسلام کی مکمل تاریخ کو پیش نظر رکھیں۔

خلفاء راشدین کے زمانے کے بعد سیاسی اقتدار مسلمانوں میں دنیاوی اقتدار کی صورت اختیار کر گیا۔ عباسیوں نے مذہبی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی ان کی حکومت گر گئی۔ لیکن امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں سیاسی حقیقت ان افراد کی طرف سے پھیلائی گئی لاقانونیت تھی جن کے پاس مسلح فوج تھی، کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی تھی جس کے ذریعے خلافت کو اقتدار میں لایا جاتا، اسماعیلی خلیفے اتنے ہی برے تھے جتنا کہ عام حکمران۔

لہذا ان مسلمانوں نے جن کی راہنمائی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جیسے افراد فرما رہے تھے شرعی آئین سازی کے سفر کا آغاز کیا، انہوں نے وہ سب کچھ کیا جس سے وہ حکمران سے شریعت کی بالادستی اور علماء کے رسوخ کو منوا سکتے تھے۔ انہوں



نے کوشش کی کہ وہ اپنے وقت کے برے حکمرانوں کو ان تمام پابندیوں سمیت جو ہم لکھ چکے ہیں علماء اور اولیاء کے درمیان اتار لیں۔

اس باب میں میں نے وہ تمام حدود بیان کیں ہیں جو قدیم اسلام نے حکمرانوں پر عائد کی ہیں۔ اس نظام کو وضع کرنے اور عملی طور پر نافذ کرنے میں سینکڑوں برس لگے۔ بالکل اس طرح جیسے مغربی جمہوریت ایک ہی دن میں نمودار نہیں ہو گئی شرعی آئین کو مرتب ہونے میں سینکڑوں سال لگ گئے۔

اب مختصر یہ کہ امام غزالی جیسے لوگوں نے محسوس کیا کہ ہر حوالے سے مکمل سلطان کی تلاش بے سود ہے اس لئے بہتر یہ تھا کہ موجودہ حکمران کو تسلیم کر لیا جائے اور اسے شریعت میں اتارا جائے یہ اسی وجہ سے تھا۔

یہ بات مغربی دانشوروں کے علم میں نہیں تھی لہذا انہوں نے لکھا کہ اسلام ظالم حکمران کو تسلیم کرتا ہے۔ تیسرا یہ کہ مغربی اصحاب علم نے اس بات کا احساس نہیں کیا کہ شرعی آئین کا نظام جلد ہی انیسویں صدی کی ابتداء میں ختم ہو گیا اور انہوں نے سوچا کہ انیسویں صدی میں موجودہ مسلمانوں کی مخصوص طرز کی مصری اور عثمانی حکومتیں اسلامی حکومتیں ہیں حالانکہ وہ بڑی ہی استبدادی تھیں۔

جب یورپ وراد ہوا تو اللہ واحد کی حکمرانی جلد ہی ختم ہو گئی، شریعت سے جان چھڑائی گئی، علماء کو دیوار سے لگایا گیا، اور لیاء پر ظلم کے گئے، وقف لوٹ لیا گیا اور حکومت بغیر کسی قسم کی پابندی کے کام کر رہی تھی عموماً مغربی طاقتوں کی مدد سے یا پھر ان کے دباؤ سے ایسا کچھ کرایا گیا جو محمود علی جیسے لوگوں نے مصر میں کیا۔ اس کا نتیجہ ایک مکمل طور پر ظالمانہ حکومت تھی جس میں حکمران پر کسی قسم کی کوئی حد نہیں تھی۔ یہ حکومتیں اپنے لئے خدا کی طرف سے نامزدگی کا دعویٰ کرتی تھیں اور یہ کہ ان کی مخالفت کرنا اللہ تعالیٰ کی مخالفت کے برابر تھا۔ ظلم اور بدعنوانی ان حکومتوں کے زیر اثر افسانوی صورت اختیار کر گئے۔ مغربی دانشوروں نے اسے

اسلامی حکومت تصور کیا اور اس تبدیلی کو محسوس نہیں کیا جو وقوع پذیر ہو چکی تھی۔

چوتھا یہ کہ مسلم حکومت کو استبدادی قرار دینا مغرب کے حق میں تھا۔ وہ مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے لہذا بطور دلیل یہ کہنا ان کے حق میں تھا کہ خود حکومت کرنے سے بہتر ہے کہ مغرب حکومت کرے بس یہ کہنا حق بجانب ہے کہ مسلمان حکومت کرنے کے لائق نہیں۔ لہذا انہوں نے دلیل دی کہ مسلم حکومت ہمیشہ سے ہی بری طرح ظالمانہ تھی اور ظالمانہ رہے گی کیوں کہ مسلمان دنیا نے کبھی اس کی صحیح کی کوشش ہی نہیں کی۔

بلاشبہ شرعی نظریہ اقتدار نے مغربی غلبے کے خلاف مسلمانوں کا دفاع کیا جب تک شریعت اور علماء زندہ تھے، سرمایہ داریت اور نوآبادیاتی نظام متعارف نہیں کرایا جاسکتا تھا۔ مسلمان عالم قاضی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے یا مثال کے طور پر وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ مسلمانوں سے ان کی جائیداد چھین لی جائے۔ مسلمان عدالت نے مسلمانوں کا دفاع کیا یوں اس سے بھی جان چھڑائی پڑی لہذا کوئی بھی کام کرنے کے لئے یہ واجب ٹھہرا کہ اسلام کا بطور ظالم ذکر کیا جائے۔ جب بھی مسلمانوں نے اسلام یا کسی بھی اسلامی اقتدار کا حوالہ گلے سے اتارنے کی کوشش کی تو بس یہ لازم تھا کہ وہ اسلامی حکومت کو استبدادیت کا نام دیتے۔

یہ بات ہمیں نہایت ہی اہم مقام پر لے آتی ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اسلام میں استبدادیت پر اصل روک خود اسلام ہے۔ شریعت علماء اور اولیاء ہیں۔ اسلام جس قدر زیادہ موجودہ ہوتا ہے، استبدادیت اس قدر کم ہوگی اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام پر کوئی بھی ضرب لگانا سیدھا استبدادیت کی طرف جانا ہے۔ استبداد پسند حکمرانوں کے راستے میں واحد رکاوٹ مذہب تھا تب لادینیت کا راستہ سیدھا استبدادیت کی طرف جاتا تھا۔



مغرب میں جمہوریت نے جوں جوں قدم آگے بڑھائے مذہب پسپا ہوتا گیا۔ مسلم دنیا میں جوں جوں اسلام پسپا ہوا استبدادیت آگے بڑھتی گئی۔ سیاسی کلچر اچانک پیدا نہیں کیا جاسکتا یہ بہت آہستگی اور مشکل کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔ اگر مغرب میں جمہوریت ہے تو یہ صدیوں کی سیاسی روایت کا نتیجہ ہے۔ لادینیت اسلام اور مسلم عوام کے پورے سیاسی کلچر کو بہالے گئی۔ اگر مسلم دنیا میں مغرب کے وارد ہونے سے استبدادیت کا طاعون پھیل چکا ہے تو اس کا ٹھیک سبب لادینیت کی پیش قدمی اور اسلام کا زوال ہے۔

لہذا آزاد معاشرے کی طرف واپسی کا راستہ بالخصوص اسلام کی طرف سے ہو کر گزرتا ہے۔ صرف قدیم اسلام میں ایسی روایات اور عوام کے ہاتھ میں ایسے اختیارات ہیں جو بڑی حکومت کے اختیارات کو محدود کرتے ہیں۔ صرف شریعت کو غالب کرنے، علماء اولیاء اور پوری اسلامی ریاست کے احیاء سے ہی استبدادیت پر حدیں لگائی جاسکتی ہیں۔ صرف قدیم اسلام ہی یہ کام کر سکتا ہے۔ گمراہ لوگ بھرپور ظالمانہ نظام کے علاوہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ایک ہی نظر میں مناسب ثبوت مل جاتا ہے۔ وہ اصل اسلام کو مکمل طور پر فراموش کر چکے ہیں اور شریعت کو تباہ کر چکے ہیں، علماء اور اولیاء کی جگہ پولیس اور مطلق العنانیت نے لے لی ہے۔

اسلام سے متعلق اہل مغرب کے بہتان جھوٹ پر مبنی ہیں۔ مغرب بذات خود مکمل نہیں ہے۔ فرانس کے شہنشاہ لوکس شش دھم نے اپنے لئے مکمل اطاعت کا دعویٰ کیا کیوں کہ وہ اسے بادشاہ کا حق سمجھتا تھا اور پاک مکمل مجبود تھا۔ (معاذ اللہ) بیسویں صدی میں مغرب نے اشمائیت اور فسطائیت اختراع کی جو کہ اب تک کے معلوم نظاموں میں سب سے زیادہ ظالمانہ نظام تھے۔ کچھ مغربی حکومتیں استبداد پسند ہیں لیکن مغربی جمہوریت کسی بھی مسلم ملک میں متعارف نہیں کرائی

گئی۔ اچھی حکمرانی کے حوالے سے مسلمانوں کی اپنی روایات ہیں اور وہ استبداد پسندی سے صرف اس صورت میں آزاد ہو سکتے ہیں اگر وہ اپنی انہیں روایات کی طرف لوٹیں۔

وہ مسلم روایات یہ ہیں کہ اللہ واحد کی حکمرانی ہو۔ آج کل مسلمان ویسی ہی صورتحال سے دوچار ہیں جیسا کہ امام غزالی نو سو سال پہلے تھے۔ مسلمانوں پر جو حکومت ہے وہ خالصتاً دنیاوی حکومت ہے مکمل طور پر لاقانیت کا شکار اور استبدادانہ۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کے خلاف بغاوت نہ کی جائے اور ہر مسلم ملک میں بغاوت ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ تمام مسلمان حکومتیں جانتی ہیں کہ انہیں حکمرانی کا کوئی حق نہیں نتیجے کے طور پر انہوں نے لمبی چوڑی خفیہ پولیس پالی ہوئی ہے۔ مسلم دنیا میں ریاست پورے معاشرے پر مکمل قبضہ جما چکی ہے، یہاں مسلمانوں کی کوئی بھی آزادی باقی نہیں رہی۔

مسلمانوں کے لئے آگے جانے کا راستہ بہر صورت آزاد مسلم معاشرے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے لئے علماء اولیاء کو چاہئے کہ موجودہ ریاست کو شرعی آئینی نظریے میں اتاریں۔ یہ فوراً نہیں ہوگا لیکن یہ آگے نکلنے کے لئے حقیقی راستہ ہے۔ اس موجودہ ریاست کو بہر صورت پیچھے چھوڑنا ہوگا۔ استبدادیت صرف اس صورت پسپا ہوگی جب اسلام آگے بڑھے گا اور قدیم اسلام صرف اسی صورت میں آگے بڑھے گا جب ہمارے دل میں حضرت محمد ﷺ کی عظیم محبت جلوہ افروز ہوگی۔



## اللہ واحد کی حاکمیت کا خاتمہ اور مسلم دنیا کے مسائل

گزشتہ باب میں قدیم اسلام کی سیاسی تنظیم کے بارے میں عرض کر چکا ہوں جو کہ اللہ واحد کی حاکمیت پر مبنی ہے۔ اس باب میں عرض کیا جائے گا کہ کس طرح اللہ واحد کی حاکمیت اختتام کو پہنچائی گئی، اس کی جگہ کس نے لی۔ یہ بھی عیاں کیا جائے گا کہ اللہ واحد کی حاکمیت کے اختتام سے کیسے مسائل پیدا ہوئے جو مسلمانوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

انیسویں صدی کے آغاز تک قدیم اسلام کی سیاسی تنظیم ”اللہ واحد کی حاکمیت“ مسلم دنیا کے بڑے حصے کا احاطہ کئے ہوئے تھی تب مسلم دنیا میں مختلف مقامات اور اوقات میں مغرب کی مکمل فاتحانہ پیش قدمی کے ساتھ اس کا اختتام ہو گیا۔ یہ اختتام بعض مقامات پر مغرب کی براہ راست نوآبادیانہ حکومت کے قیام سے اور بعض دوسرے مقامات پر خود مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ہوا جو کسی حد تک مغربی دباؤ کے زیر اثر ایسا کر رہے تھے اور کچھ مغرب کی نقالی کی خواہش کے نتیجے کے طور پر، انہوں نے مغربی سیاسی نظام کی نقل اتاری اور ساتھ ہی ساتھ اللہ واحد کی حکمرانی سے خود کو آزاد کرایا۔ یہاں میں محض مثال کے طور پر چند چیزیں عرض کروں گا کہ کیا ہوا۔

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ اللہ واحد کی حکمرانی کی کلید علماء کی مخصوص حیثیت ہے۔ اللہ واحد کی حاکمیت کے خاتمے میں زیادہ سرگرمی ان حکمرانوں نے دکھائی جو کہ علماء کی معاشرے میں مخصوص حیثیت اور ان کے

اختیار سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔

خلافت عثمانی میں یہ واقعہ 1839ء سے 1876ء کے درمیانی عرصے میں ہوا۔ اصلاحات متعارف کرائی گئیں جو کہ ”تنظیمات خبری“ کہلائے جن کا مطلب نفع بخش اصلاحات تھا۔ اس سے قبل علماء بتدریج اختیارات کھو چکے تھے۔ مثال کے طور پر ۱۸۲۶ء میں علماء کی وفادار افواج ”جائش“ پر ڈھائے جانے والے ظلم کا واقعہ لیکن تنظیمات کے دوران علماء اختیارات سے بالکل محروم ہو گئے۔ وہ دولت جو انہیں خود مختار بنائی تھی یعنی ”وقف“ ریاست کے زیر تصرف چلا گیا۔ علماء انتظامی کنٹرول کے تحت لائے گئے اور انتظامیہ میں ان کا کردار مغربی طرز کی نوکریاں ایسا بن گیا۔

حکومت میں شریعت سے جو کہ اللہ واحد کی حاکمیت کا ایک اور مرکزی ستون ہے، منحرف ہونے کی جرات نہیں تھی لیکن حقیقت میں انہوں نے شریعت کو تباہ کیا۔ انہوں نے اصل قدیم شریعت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا اور اس جگہ اپنی پسند کی خود ساختہ شریعت نافذ کر دی۔

شریعت صرف کتابوں کا ایک بے ترتیب ڈھیر نہیں، یہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ یہ علماء کے ذریعے زندہ رہتی ہے، وہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں، اس کی تشریح کرتے ہیں اور اس کا تازہ بہ تازہ اطلاق کرتے ہیں بالکل اس طرح جیسے انگریزی قانون محض کتابوں کا نام نہیں لیکن ماہرین قانون، جج اور برطانوی عدالتی انجمنیں اسے ایک زندہ حقیقت بنا دیتی ہیں۔ اب وہ چاہتے تھے کہ شریعت کو محض اپنی حکومت کے ایک حصے کے طور پر باقی رکھیں اور علماء سے چھٹکارا حاصل کر لیں لہذا انہوں نے شریعت کی تلخیص کر دی۔ شریعت محض قانون کی ایک کتاب بن گئی جسے کوئی بھی وکیل استعمال کر سکتا تھا یہاں تک کہ دوسرے ملک کا غیر مسلم وکیل بھی، لہذا علماء کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔



عین اس وقت عثمانیوں نے علماء کی سرپرستی کے بغیر ایک لادین اور غیر اسلامی نظام تعلیم قائم کیا جو نئے انتظامی عملے کی ترتیب کرتا تھا۔ وقف کی آمدنی کے نہ ہونے کے سبب علماء کا تعلیمی نظام تباہ ہو گیا۔ نتیجتاً نہ صرف علماء کا رسوم زوال پذیر ہوا بلکہ خود علماء بھی رُو بہ زوال ہو گئے۔ اٹھارویں صدی کے علماء اتنے ہی لائق تھے جتنا کہ باقی دنیا کے۔ جلد ہی علماء ناپید ہو گئے، جو موجود تھے وہ گاؤں کی مسجدوں کے امام تھے جو کہ اس قابل نہیں تھے کہ اعلیٰ پیمانے کے سیاسی معاملات میں کوئی بھرپور کردار ادا کرتے باقی ماندہ علماء نئی سول سروس کے رکن بن گئے۔

تنظیمات ناکام ہو گئیں، یہ ایک اسلامی رد عمل کا نتیجہ تھا جس کی قیادت سلطان عبدالحمید کر رہا تھا لیکن اس کی حکومت زیادہ دیر تک اللہ واحد کی حکمرانی قائم نہ رہی۔ سلطان عبدالحمید نے علماء پر اعتبار نہ کیا۔ درحقیقت اسلام بھی محض ایک سیاسی نعرہ کے آغاز سے ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں فرانسیسی جنرل نیپولین نے مصر فتح کیا۔ علماء نے نیپولین کے خلاف حزب اختلاف کی قیادت کی اور فرانس ۱۸۰۱ء میں واپس چلا گیا، ایک عثمانی گورنر وارد ہوا اس نے مصر کو لوٹا اور علماء نے اسے نکال باہر کیا۔

تب علماء نے محمد علی کو دعوت دی۔ جوں ہی وہ مناسب حد تک طاقتور ہوا اس نے علماء پر ضرب لگائی ان کے قائد کو ملک بدر کر دیا، وقف کر ضبط کر لیا اور علماء کو اپنی تنخواہ کے حوالے سے اپنا محتاج بنالیا۔ تب محمد علی نے مغربی انداز و اطوار اپنانے کا ایک پروگرام شروع کیا۔ معاشرے میں علماء کا مقام نئی نوکری شاہی، تاجر طبقے اور مغربی دانشوری کے حامل افراد نے سنبھال لیا۔ محمد علی نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں مرکز کر لئے۔ صوفی سلسلے اور انتظامیہ سب کچھ حکومتی تصرف میں چلے گئے اس نے تمام تجارت اور زرعی زمین اپنے قبضے میں لے لی، علماء سے

الطہار است اور دولت دونوں چھین لی گئیں، وہ زندہ رہے لیکن افلاس کا شکار رہے۔ مسجد الازہر کے پاس اتنی دولت تھی کہ اٹھارویں صدی میں وہ پوری دنیا میں ایک نمایاں یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر گئی تھی لیکن ایک صدی بعد وہ بالکل تباہ ہو گئی۔ زرخیز اسلامی کلچر جسے علماء بحال رکھے ہوئے تھے ضائع ہو گیا کیوں کہ علوم مستونے تمام دولت چرائی۔ بلاشبہ شریعت کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ تینس میں ۱۸۳۵ء میں خیر الدین وزیر اعظم بنا اور بالکل تنظیمات کی ہی اصل کی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے اوقاف قبضہ میں لینے کا سلسلہ شروع کیا اور ایک سول سروس شروع کی تاہم علماء نے اس کی مخالفت کی وہ ناکام ہوا اور ۱۸۷۸ء میں اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھا لیکن اس کی اصلاحات نے مغربی انداز کی حوصلہ افزائی کی اور فرانس نے ۱۸۸۱ء میں ملک پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے علماء کے اداروں سے رواداری برتی اور علماء زندہ رہے، ان کی اقتدار سے ملتی برطرفی اس وقت عمل میں آئی جب فرانس چلا گیا، مغرب نواز لادین حکمرانوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔

ان تمام ممالک میں قدیم اسلام زندہ رہا لیکن اس نے زیادہ دیر تک ملک اور معاشرے پر حکمرانی نہیں کی۔ روایتی مسلمان، علماء، اولیاء صوفی سلسلے اور شریعت معاشرے میں ایک جزیرے کے طور پر زندہ رہے حاکمیت کے ان حکمرانوں کے ہاتھوں جنہوں نے اللہ واحد کی حاکمیت کی جگہ لی تھی۔ بعض اوقات ان کے ساتھ رواداری برتی جاتی اور بعض اوقات ظلم کیا جاتا۔

اسی سے ملتی جلتی چند کہانیاں پوری مسلم دنیا کے بارے میں سنائی جاسکتی ہیں۔ جیسے ہی غیر ملکیوں یا اپنے حکمرانوں نے علماء اور شریعت کے پورے نظام کو منہدم کیا اللہ واحد کی حاکمیت اختتام پذیر ہو گئی۔ ہر جگہ اللہ واحد کی حکومت ختم ہو گئی اور ہر مقام پر اس کی جگہ ایسی تنظیم نے لے لی جسے یا تو مغرب سے درآمد کیا



گیا یا پھر مغرب کی نقل اتاری گئی۔ یہ نئی سیاسی تنظیم مغرب کا سیاسی نظام تھا جسے جدید ریاست کے طور پر جانا جاتا ہے۔

یہ جدید ریاست مسلمانوں کے سیاسی نظام یعنی اللہ واحد کی حاکمیت والے نظام سے بالکل مختلف تھی۔ اس مسلم دنیا کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل تب سے ہی نئی ریاست کی درآمد کا نتیجہ ہیں۔ اگر بہ نظر غائر اس کا جائزہ لیں کہ جدید ریاست کیا ہے تو ہم بہت وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی انتظام اللہ واحد کی حکمرانی کی نوعیت سمجھ سکتے ہیں اور ہم ان مسائل کی تہہ تک پہنچ جائیں گے جو کہ مسلم دنیا کو آج کل درپیش ہیں۔

جدید ریاست سولہوی صدی میں یورپ میں نمودار ہوتی نظر آتی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی اور مختلف شکلوں صورتوں میں ارتقاء پزیر ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اپنی سرحدوں کے اندر سب سے برتر ہے۔ جدید ریاست خود کو سب سے برتر سمجھتی ہے، ہر فرد اور ہر اس چیز سے برتر جو اس کے دائرہ کار کے اندر ہیں۔ اسے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی حدود کے اندر سب سے برتر ایک مقتدر سیاسی ڈھانچہ! وفاداری صرف اسی ایک کے لئے ہے، تنہا وہی طاقت کا درست استعمال کر سکتی ہے۔ ریاست کے علاوہ ہر فرد اور ہر ادارے کو اسی جدید ریاست کے ذریعے کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ ریاست اگر مناسب سمجھے تو وہ کوئی بھی قانون بنا سکتی ہے اور صرف وہی صحیح قانون بنا سکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام باشندے ریاست کے شہری ہیں اور ریاست کی نظروں میں برابر ہیں۔ اگر کوئی شخص شہریت کا حامل نہیں تو وہ بدیسی ہے۔

لہذا اس پر واجب ہے کہ وہ اس کی حدود سے باہر رہے۔ ریاست انتظامی عملداروں پر مشتمل ایک لمبا چوڑا حکومتی عملہ ہے۔ فوج شہریت کے حامل افراد پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں ریاست اپنے دفاع کے لئے طلب کرتی ہے کہ اس پر

اپنی زندگیاں نثار کرے، سب سے بڑھ کر یہ کہ جدید ریاست فرد واحد کے لئے ہے یعنی محدود افراد کے لئے (فرانسیسی ریاست فرانسیسی افراد کے لئے ہے اور برطانوی ریاست، برطانوی افراد کے لئے۔ پس ایک ریاست کو لازماً ایک ہی قوم کی ریاست ہونا چاہئے یا پھر اپنے شہریوں کی ایک قوم تشکیل دینی چاہئے۔ لہذا وہ تمام افراد جو اٹلی میں رہتے ہیں اٹلی کی شہریت رکھتے ہیں ان سے توقع کی جاتی ہے کہ ان کی پہلی اور واحد ترجیح اٹلی کو ہونا چاہئے۔ ریاست کو مکمل حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو تعلیم سے آراستہ کرے اور انہیں وفادار بنائے۔ یہاں اس بات پر کوئی پابندی نہیں کہ ریاست تعلیم، کلچر، مذہب یا زندگی کے کسی دوسرے پہلو میں مداخلت کرے۔ ریاست شہریوں کی دولت اور ان کے کام سے بھی برتر ہے۔ ریاست کسی بھی معاشی سرگرمی کو اپنے کنٹرول میں لے سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست ساری صنعت اور تمام معیشت پر قبضہ کر سکتی ہے، ایک سوشلسٹ یا کمیونسٹ ریاست بن سکتی ہے، ریاست اپنے مساوی اگر کسی کو سمجھتی ہے تو وہ دوسری ریاست ہے۔ مساوات کی بنیاد حق اور قانون پر نہیں بلکہ طاقت اور قوت پر ہے۔ ریاستوں کے درمیان تعلقات کا انحصار طاقت کے توازن پر ہے۔

جدید ریاست کی فرمانبرداری کی جاتی ہے، اس سے محبت بھی کی جاتی ہے، بہت سارے مقامات و مواقع پر اس کی پوجا کی جاتی ہے، اس کا موازنہ خدا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ریاستی کارکردگی کو اس طرح دکھایا جاتا ہے کہ گویا تمام مسائل کا حل ہے۔ اگر ریاست میں کوئی بھی مسئلہ سر اٹھاتا ہے تو ریاست لازماً قانون سازی کرتی ہے یا پھر ریاستی انتظامیہ لازماً کچھ نہ کچھ کرتی ہے۔ ایسا کرنا صرف ریاست کی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ یہ اس کا حق بھی ہے۔ زندگی کی تمام تر سرگرمیوں کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ریاست کا جائز دائرہ عمل



ہیں، اقتدار اعلیٰ حقیقی طور پر تنہا ریاست کے پاس ہے۔

یوں اللہ واحد کی حاکمیت کو ریاست واحد کی حاکمیت سے بدل دیا گیا۔ آج کل ہم ریاست اور اس کے دعوؤں کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ انہیں اپنے اوپر احسان سمجھتے ہیں لیکن ہمیں ان بلند بانگ دعوؤں کو محسوس کرنا چاہئے جو ریاست کرتی ہے۔

ہمیں یہ بھی احساس کرنا چاہئے کہ ریاست کے یہ دعوے اسلام سے بالکل مختلف ہیں۔ آج کل بہت سے مسلمان ریاست اور اس کے دعوؤں کو تسلیم کرتے ہیں۔ جدید ریاست کا اسلام میں کوئی وجود نہیں، جدید ریاست اللہ واحد کی حکمرانی سے بالکل مختلف ہے۔

قدیم اسلام میں بلاشبہ ایک حکمران ہے جو کہ سلطان کہلاتا ہے لیکن وہ مقتدر اعلیٰ نہیں ہے جیسا کہ پچھلے ابواب میں وضاحت کی گئی ہے کہ اختیارات نیچے تک تقسیم کر دیئے گئے ہیں اور انہیں اس انداز میں پھیلا یا گیا ہے کہ فرد واحد حکومت نہیں کر سکتا۔ حکمران کو بہر صورت شریعت کا پابند ہونا ہوتا ہے جبکہ شریعت کی تشریح علماء کرتے ہیں جس سے حکمران پر پابندیاں لگ جاتی ہیں لیکن کوئی بھی شخص شریعت نہیں بنا سکتا۔

قدیم اسلام میں شریعت میں تبدیلی ناممکن ہے کیوں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے لہذا اللہ واحد کی حاکمیت میں کسی فرد کو قانون سازی کا اختیار نہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں جو کہ ممکنہ ریاستی قانون ہو۔ شریعت میں فقہ کے چار دبستان ہیں جو مسلمانوں کی اپنی پسند کا مجموعہ قوانین ہیں۔ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے قانونی نظام کے تابع رہیں نہ کہ کسی متفقہ ریاستی نظام کی۔

شہریت رکھنے کی موجودہ عالمگیر روایت کا قدیم اسلام سے کوئی بھی تعلق

نہیں، موجودہ ریاست تمام شہریوں سے مساوات کا تقاضا کرتی ہے۔ قدیم اسلام میں ہر مذہبی گروہ کو الگ بطور ایک ملت منظم کیا جاتا ہے اور یہاں مشترکہ شہریت کا کوئی تصور نہیں کوئی بھی شخص کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ سلطان ایک چھوٹے سے خطے پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان دارالاسلام میں کہیں بھی جاسکتا ہے اسے یکساں طور پر خوش آمدید کہا جاتا ہے اور اسے ہر جگہ گھرا یا ماحول میسر ہوتا ہے۔ ابن عربی جیسا فرد اپنی زندگی میں پوری مسلم دنیا میں مسافرت کرتا ہے اور اس سے کبھی بھی پاسپورٹ دکھانے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ اسلام میں کوئی پاسپورٹ نہیں، اسلام میں کوئی شہری نہیں، کوئی سرحد نہیں اور کوئی جدید ریاست نہیں، سیاسی اقتدار کسی طبقہ کے پاس نہیں، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمان ریاست کو کنٹرول کرتے ہیں۔ سلطان مسلم تاریخ میں مسلم معاشرے سے باہر ہوتا تھا، اس کی فوج عموماً اس کے اپنے زیر تصرف ہوتی تھی۔ سلطان کو علماء آگاہ کر سکتے ہیں کہ اس کا رویہ کیسا ہونا چاہئے۔ سلطان کو مذہبی گروہوں پر کوئی کنٹرول حاصل نہیں ہوتا مثال کے طور پر اس سلطان کے زیر تسلط رہنے والے ہندو کو اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ مسلم گروہ انہیں نگل جائے گا۔ مسلم معاشرہ سلطان کو کنٹرول نہیں کرتا۔

بادشاہ کو ہر حوالے سے تھوڑے بہت اختیارات حاصل ہوتے تھے، علماء تعلیم اور عدلیہ کے شعبوں کو کنٹرول کرتے تھے، سماجی تحفظ اور بہبود کے شعبوں کو علماء اور صوفی سلسلے سلطان کی ضرورت محسوس کئے بغیر منظم کرتے تھے، معاشی اور سماجی ڈھانچہ مکمل طور پر سلطان کی دسترس سے باہر تھا کیوں کہ شریعت، تعلیم، زراعت اور خاندان وغیرہ کے معاملات کی نگرانی کرتی تھی، معیشت آزاد کی صورت میں تھی اور تاجرانہ معیشت پوری دنیا پر پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی بھی سلطان اسے منظم کرتا اور نہ ہی اس کی سمت کا تعین کرتا تھا۔



کم از کم قدیم اسلام میں سلطان کے پاس کوئی نظریاتی اختیار نہیں تھا۔  
 قدیم اسلام میں سلطان صرف ایک حکمراں ہوتا تھا اور اس کے پاس کوئی مذہبی یا  
 نظریاتی اختیار نہیں تھا۔ سلطان نہ ہی کسی سول سروس کا سربراہ ہوتا تھا اور نہ ہی  
 منتظم۔ بلاشبہ فوج اور محلات کو منظم انداز میں چلانے کے لئے سلطان کے پاس  
 وزیر کلرک اور دوسرا ضروری عملہ ہوتا تھا لیکن یہ لوگ سلطان کے ذاتی ملازم ہوتے  
 تھے۔ مغرب میں ایک ریاست کا انتظامی عملہ اپنے بل لوتے پر موجود ہوتا ہے اور  
 اس کی تقرری بھی وزیر اعظم یا صدر نہیں کرتے۔ موجودہ انتظامی ڈھانچے کے  
 حوالے سے ریاست کی ایک حقیقی خود مختار زندگی ہے اسلام میں اس طرح کا کوئی  
 تصور موجود نہیں۔

سلطان کی طاقت کے حوالے سے بھی کوئی اجارہ داری نہیں تھی۔ اس کے  
 علاقے میں اور بھی منظم مسلح قوتیں ہو سکتی تھیں اگرچہ یہ مسلح قبائلی ہی کیوں نہ  
 ہوں۔ اس کے شہروں میں اسلحہ بہت سارے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ  
 سلطان کی مسلح قوتیں سب سے زیادہ طاقتور ہوں۔

مسلم تاریخ میں اکثر اوقات ہم ایسے سلطان بھی پاتے ہیں جو ٹیکس وصول  
 نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ انہیں آبادی سے ٹیکس وصولی کے لئے ایک خاص فوج  
 کھڑی کرنی پڑتی تھی۔ پورے کا پورا جمع شدہ ٹیکس اس فوج کی تنخواہوں پر اٹھ  
 جاتا تھا جو اسے جمع کرتی لہذا ٹیکس جمع کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ پرانے  
 اسلام میں ریاست کا سرے سے تصور ہی نہیں اگر آپ سیاسی تصور پر لکھنے والے  
 مارور دی، غزالی اور ابن تیمیہ جیسے مصنفین کا مطالعہ کریں آپ دیکھیں گے کہ وہ  
 اس ریاست کو زیر بحث ہی نہیں لاتے، وہ حکمراں خلیفہ یا سلطان کے بارے میں  
 بات کرتے ہیں۔ پہلا مسلم مفکر جس نے ریاست پر اس حیثیت سے بحث کی،  
 افغانی ہے، انیسویں صدی کا مسلم جدت پسند جو کہ تنظیمات کا بہت بڑا حامی تھا۔

پرانے مسلم مفکرین کے بالکل چند ہی کام تھے۔ وہ بنیادی طور پر یہ تھے۔  
 مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے مسلح افواج کا انتظام، جنگ کی صورت میں  
 قیادت کرنا اور معاشرے میں امن کو یقینی بنانا لیکن وہ یہ اس لئے کرتا تھا کہ معاشرہ  
 خود قائم رہے۔ وہ معاشرے میں سب سے برتر نہیں ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے  
 راہنما علماء اور اولیاء ہیں نہ کہ سلطان۔

مسلمان سلطان کا وفادار نہیں ہے وہ علماء کا وفادار ہے۔ حکمراں امت،  
 اسلام اور شریعت کا خادم ہے۔ قدیم اسلامی سیاسی نظریے کا اہم نکتہ یہ ہے کہ  
 حکمراں کو ایک فرض شناس خادم کی طرح وہ کافی زیادہ منصف، دانا اور نیک ہو۔  
 جدید ریاست اتنی زیادہ طاقتور ہے کہ بہت ساروں کے نزدیک تو یہ بذات  
 خود معاشرہ ہے۔ ہر فرد اور ہر ادارہ ریاست کے اندر داخل ہے۔ قدیم اسلام  
 میں حکمراں اتنا غیر اہم ہے کہ وہ تقریباً معاشرے سے ہی باہر ہے۔ سلطان  
 معاشرے سے کٹ کر اپنے محل میں اپنے شاہی معمول، شاہی سلسلے، شاہانہ  
 معمولات اور سپاہیوں کے ساتھ رہتا ہے اور معاشرہ اپنی راہ چلتا ہے۔ مسلمان  
 ایک آزاد گروہ کی طرح علماء اور اولیاء کی قیادت میں شرعی احکامات کے مطابق  
 اسلامی زندگی گزارتے ہیں اور سلطان سے اس قدر دور رہتے ہیں جتنا کہ وہ رہ  
 سکتے ہیں۔

جدید ریاست اسلام سے بالکل اجنبی ہے۔ جب اسے مسلم دنیا میں  
 متعارف کرایا گیا تو یہ اپنے ساتھ بہت سارے مسائل لائی۔ اب ہم ان مسائل  
 پر ایک نظر ڈالیں گے۔ جب جدید ریاست متعارف کرائی گئی تو علماء کو دیوار کے  
 ساتھ لگا دیا گیا اور سب سے پہلی چیز جو کھڑی کی گئی وہ نئی نوکر شاہی کے انداز کی  
 سول سروس انتظامیہ تھی تمام اختیارات انتظامی عملے کے ہاتھ میں یکجا کر دئے  
 گئے اور سلطان کی حکمرانی کو بدل کر حقیقت میں افسروں کی حکمرانی بنا دیا گیا۔ نتیجہ



یہ نکلا کہ کئی قسم کے افسروں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو گیا۔

۱۸۱۰ء میں استنبول میں پندرہ سو افسر تھے۔ ۱۹۰۰ء تک ان کی تعداد پچاس ہزار سے بڑھ چکی تھی ساتھ ہی ساتھ فوج کو بھی مغربی خطوط پر نئے سرے سے منظم کیا گیا بالکل اسی طرح انتظامی عملے میں پھر پورا اضافے کے ساتھ یہ سب کچھ بہت زیادہ مہنگا تھا۔ لہذا بہت جلد یہ نئی ریاستیں دیوالیہ ہو گئیں۔ لبالب یہ کہ دوسرے ملکوں سے قرضے لئے گئے پھر مزید قرضے اور پھر مزید مغربی مداخلت۔ ریاستی قرضے کے بحران نے برطانیہ کو مصر کی راہ دکھائی اور فرانس کو تیونس کی۔

عملداروں کے اس بہت بڑے گروہ نے زندگی کے ہر گوشے پر چڑھائی کر دی۔ نئی حکومت نے اسکول اور وقف چلانے شروع کئے اور ساتھ ہی دیہاتوں میں مداخلت شروع کر دی پس زیادہ اور مزید زیادہ عمل کی ضرورت پڑی لہذا ریاست مزید زیادہ مالیاتی کمی کا شکار ہو گئی، اس دن سے تمام مسلم ممالک قرضے کے لئے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں تاکہ زیادہ جدید (Modern) ہو سکیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ریاستی عملداروں کو زندگی کے نئے شعبوں میں مداخلت کے لئے بھیج سکیں۔

ریاستی عملداروں کا یہ بہت بڑا ہجوم پہلے بھی بدعنوان تھا اور اب بھی ہے۔ یہ رشوت لیتے ہیں اور ان کا وجود ہر شہری پر بوجھ ہے۔ مسلم دنیا کی نوکر شاہی کی ناچختہ کاری اور بدعنوانی افسانوی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے۔ پس پورا معاشرہ گھٹن کا شکار ہے۔ شہر کے سوداگر سے لے کر ایک عام شہری تک آپ کو بتا سکتے ہیں کہ ان بے مایہ چھوٹی ریاستوں کے عملدار ہر چیز میں ٹانگ اڑاتے پھرتے ہیں اور مکمل طور پر بدعنوان ہیں۔ علم و ادب اور ذوق و جدانیت کا دم گھٹ رہا ہے۔ قاضی جلد انصاف اور فوری فیصلے دیا کرتے تھے۔ نئی انتظامیہ نے تاخیر کے

حربے سے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں۔

یہ ریاست اتنی بڑی ہے کہ ہمیشہ اس میں اصلاح کے منصوبے بنتے رہتے ہیں اور بار بار بنتے رہتے ہیں۔ ریاست کبھی ترقی پر مطمئن نہیں ہوتی بلکہ ہر تبدیلی کے پیچھے نئی تبدیلی ہوتی ہے۔ نئے عملداروں کو جو کہ جلد ہی بدعنوان ہو جاتے ہیں کو موجود بدعنوان عملداروں کی نگرانی کے لئے تعینات کیا جاتا ہے لیکن یہ نئی ریاست بیکار ہے، نئی افواج کبھی بھی اس قابل نظر نہیں آئیں کہ جنگیں جیت جائیں۔ ریاست کے منصوبے ہمیشہ غلط سمت میں جاتے ہیں، زیادہ ریاستیں نمودار ہوتی ہیں اور زیادہ جدید ہونے کی کوشش کرتی ہیں لیکن صورتحال پہلے سے بھی بری ہو جاتی ہے۔ اب مغربی ریاستیں بھی نا اہل اور بدعنوان انتظامی افراد کے مسئلے کا شکار ہیں۔ مغرب میں اس کا سب سے بڑا علاج مقبول عام نمائندگی ہے اس طرح عوام کی اکثریت اپنی آواز سنوا سکتی ہے، شکایت کر سکتی ہے اور انتظامیہ کا گردگی بہتر بنا سکتی ہے۔

یہ سب کچھ مسلم دنیا میں نہیں ہوتا کبھی بھی عوام کے حقیقی نمائندے سامنے نہیں آئے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اولاً تو جیسے گزشتہ باب میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ عوام کی نمائندگی اللہ واحد کی حاکمیت کے تحت تھی، وہ علماء، صوفی پیر اور صوفی سلسلے تھے۔ ان لوگوں کی جڑیں عوام میں گہری تھیں، اور وہ حقیقتاً سمجھتے تھے کہ عوامی سطح پر کیا ہو رہا ہے۔ جب جدید ریاست متعارف کرائی گئی تو ان علماء، اولیاء اور صوفی سلسلوں کو ایک طرف ڈھکیل دیا گیا۔ ان افراد سے چھٹکارا حاصل کر کے نئی ریاست تعمیر کی گئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نئی ریاست نمودار ہوئی لوگوں کی حقیقی نمائندگی مکمل طور پر غائب ہو گئی۔

ثانیاً صرف نئی ریاست ہی اپنا وجود برقرار رکھ سکتی تھی کیوں کہ اس نے لوگوں کی خواہشوں کو لکارتھا۔ مسلمان اللہ واحد کی حاکمیت کی برطرفی کی تائید



نہیں کرتے تھے اور جہاں کہیں بھی نئی ریاست تعمیر ہوئی عوامی مخالفت کو روند کر ہی تعمیر ہوئی۔ نئی سول سروس میں ملازم حضرات انتہائی مخالف تھے انہوں نے خود کو مغرب نواز، جدت پسند اور سائنسی علوم سے لیس سمجھا اور مسلم عوام کو جاہلوں کا ٹولہ اور توہم پرست، بے وقوف تصور کیا بس انہوں نے طے کر لیا کہ وہ کسی بھی فرد کی کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں سنیں گے۔

یوں کوئی ایسی چیز نہ بچی جو نئی ریاست کا راستہ اس طرح روکتی کہ وہ مکمل ناکامی سے دوچار ہوتی اس طرح عوام اور ریاست کے درمیان ایک خلا پیدا ہو گیا لیکن مغرب بلاشبہ اس بات پر اصرار کرتا رہا کہ جدید ریاست میں عوام ہی کے پاس اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے۔ یوں مغرب زدہ لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ لوگوں کو اسلام پر ایمان رکھنے سے روکا جائے اور انہیں ریاست اور مغرب پر ایمان لانے کے لئے مجبور کیا جائے، نتیجہ مضحکہ خیز ہے۔

ایک شخص نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ آپ کو کچھ لوگ مجبور کر رہے ہیں کہ آپ آزاد ہو جائیں، نئی ریاستوں کے مسلم حکمران عوام کو اقتدار دینے کی کوشش کر رہے تھے پس مسلم دنیا میں حقیقی جمہوریت ہو سکتی تھی اور نہ ہی اب ہے وہاں پارلیمنٹ وغیرہ کے توسط سے جمہوریت کو روشناس کرانے کی تحریکیں موجود ہیں۔ ان تحریکوں کا اصل مقصد دوسرے گروہوں جیسے مغربی طرز کی سول سروس کے ملازموں اور جدت سازوں کو اقتدار کی منتقلی ہے۔ عوام کی اصل سیاسی تحریکیں کی قیادت علماء اور اولیاء کرتے تھے لیکن یہ جدت ساز انہیں برداشت نہیں کرتے تھے لہذا بہت ساری جگہوں کو تباہ کر دیا گیا۔ ایک بہت ہی عام چیز حکومت کی طرف سے سیاسی پارٹیوں کی تخلیق تھی جو کہ سیاستدانوں سے بھری ہوتی تھی جو تقرری یا پھر منتخب ہو جانے کی صورت میں محفوظ ہوتے تھے۔

بلاشبہ دوسرے فرقے اس ظالمانہ ماحول میں بہت خوش رہتے ہیں کیوں کہ

یہ قدیم اسلام کے لئے مہلک ہے اور مسلم دنیا کی نئی ریاستوں کے ظالم فرمانرواؤں میں بے حد مقبول۔ جب مغربی ریاست مسلم دنیا میں متعارف کرائی گئی تو فرض کر لیا گیا۔ نئی ریاستوں کی تمام آبادی مساوی حقوق کی حامل بن جائے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلم اور غیر مسلم کی پرانی تفریق زیادہ دیر نہیں چلے گی، مسلمانوں کی طرح یہودی اور عیسائی بھی نئی ریاستوں کے مساوی شہری ہوں گے خاص طور پر یہ چیز کہ مسلم علاقوں میں یہودیوں اور عیسائیوں وغیرہ کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائے مسلم حکومتوں پر مغربی دباؤ کا نتیجہ تھی۔

اکثر اوقات مغربی حکومتوں کے سفیر غیر مسلموں کو خصوصی مراعات دلانے کے لئے مداخلت کرتے رہتے۔ اس بات نے بلاشبہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے نفرت کرنے پر مجبور کیا جو کہ مسلمانوں کے مراعات یافتہ دشمن سمجھے جاتے تھے لیکن اس سے بھی اہم امر یہ ہے کہ اس نے ملت کی حیثیت کا خاتمہ کر دیا اب تمام مذہبی گروہوں کو اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا کہ انہیں ایک ہی ریاست میں ایک ہی حکمران کے ماتحت ایک ہی قانون کی حکمرانی میں رہنا ہے۔

ملت سسٹم میں یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ حکمران کون ہے کیوں کہ حکمران عیسائی اور یہودی ملت کے نجی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ ریاستی نظام میں اگر حکمران مسلمان ہے تو دوسرے مذہبی گروہوں کو اس بات کا خوف محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے لہذا وہ ان کے مخالف بن جائیں گے وہاں پہلے ہی نفرت موجود تھی جسے غیر مسلموں کے لئے مغرب کی امداد سے مہمیز کر دیا۔

نتیجہ ایک زوردار دھماکہ تھا۔ مسلم دنیا میں اس وقت سے لے کر اب تک مختلف فرقوں اور مذہبوں کے ارکان میں خوفناک تصادم ہوتا آ رہا ہے۔ اس کا سبب جدید ریاست پر قبضہ جمائیں اس طرح سے بلقان میں یونان، رومانیہ،



بلغاریہ اور سربیا کی ریاستیں بنائی گئیں۔

بیسویں صدی کے آخر میں جو تصادم ہوا وہ بالکل ایسی ہی صورتحال کا شریک ہے۔ لبنان میں ۱۸۵۰ء کی خانہ جنگی اسی کا نتیجہ تھی۔ لبنان کے عیسائیوں کی حفاظت کے لئے مغرب نے مداخلت کی اور وہی ملت سٹم پھر نافذ کیا۔ آخر کار جب لبنان اپنے بل بوتے پر ایک آزاد ریاست بن گیا تو ملت سٹم پھر توڑ دیا گیا جس کے بعد ۱۹۷۵ء کی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

جدید ریاست کا ایک اور بھیا تک نتیجہ قومیت پسند نظریات کا قبول کیا جانا تھا۔ ملتوں نے خود کو ایک قوم کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا۔ مختلف مذہبی گروہ ریاست پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے لڑنے لگے مذہبی گروہ کے ہر رکن نے اپنے گروہ کی طاقت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر لبنان میں عیسائیوں کے لئے پارلیمنٹ کی نشستوں کا فیصلہ آبادی میں ان کے تعداد کے حوالے سے کیا گیا۔

اس طرح مسلم دنیا کی پوری آبادی براہ راست جنگ میں جھونک دی گئی۔ ہر وہ شخص جو غلط مذہب کا پیروکار ہے اس کا قتل واجب ہے لہذا مسلم دنیا میں نسل کشی کے آثار دیکھے جانے لگے پہلی جنگ عظیم میں آرمینیائی افراد کا قتل عام کیا گیا۔ جب ہندوستان ایک آزاد قوم کی ریاست بنا تو مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی جو قیام پاکستان کے لئے جدوجہد کر کے ہی بچ پاتے۔ آج کل نسل کشی کی مشق بوسنیا اور کشمیر میں جاری ہے۔

جونہی ریاست کی گرفت مضبوط ہوئی مسلمان آپس میں دست و گریباں ہو گئے کیوں کہ اتاترک نے ترکی کی بنیاد ترک قومیت پر رکھی (ایک ایسا نظریہ جسے مغربی دانشوروں نے ایجاد کیا)۔ کرواگرچہ مسلمان تھے لیکن انہیں ترکی میں خوش آمدید نہیں کہا گیا۔ عراق کی بنیاد ریاستی نظریے کے طور پر عرب قومیت پر

۱۷  
ہے لہذا کردوں کے دیہاتوں پر زہریلی گیس سے بمباری کی گئی۔ سعودی عرب میں سعودی خاندان نے شیعوں کو ایک مظلوم اقلیت بنا دیا۔ شام الاویسی اور بنیاد پرستوں کے درمیان ایک خونیں میدان جنگ بن چکا ہے۔ ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ اسرائیل کی بنیاد بطور یہودی ریاست رکھی گئی اور بہت سارے عرب یہودی بھاگ کر وہاں چلے گئے۔ اس لئے کہ مسلم دنیا میں اب یہودیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی حالانکہ اللہ واحد کی حاکمیت میں یہ خوشی خوشی ہوتا آیا تھا۔

ہمیں دوبارہ کہنا پڑے گا کہ جدید ریاست ہی اس صورتحال کا سبب ہے۔ جدید ریاست سے پہلے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ حکمران کا مذہب کیا ہے۔ آج کی ریاست کے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ سینکڑوں سالوں سے اقلیتوں کے انداز و اطوار اسلام کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھے۔ اب یہ چیز مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اب دنیا میں نسلی اور مذہبی کشمکش اتنی بری صورت اختیار کر گئی ہے جتنی مسلم دنیا میں مسلم دنیا میں۔ ریاست ہر کام میں ٹانگ اڑاتی ہے۔ اتاترک نے ترکوں کو بتایا کہ وہ کس قسم کے کپڑے پہن سکتے ہیں۔ بلاشبہ ریاست کبھی خواتین کے امور میں مداخلت سے باز نہیں رہی۔ ریاست نے کبھی عوام سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا سوچتے ہیں۔ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ احمقانہ قسم کے کپڑے پہنیں اور احمقانہ انداز میں شادیاں کریں۔

عورت کی زندگی اور اس کے حجاب کے موضوع پر پائی جانے والی تلخی جو تصادم کی صورت اختیار کر رہی ہے، کا سبب ریاست کی ان پہلوؤں میں مداخلت ہے۔ ریاست تعلیم میں بھی مداخلت کرتی ہے۔ کوئی بھی استاد یا پروفیسر منہ کھولنے کی جسارت نہیں کرتا جس کا نتیجہ ہولناک تعلیمی نظام ہے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی ذہن کے ساتھ مغرب کی جامعات میں جانا چاہتا ہے۔ لیکن بلاشبہ مغرب اپنی یونیورسٹیوں اور اسکولوں کو تباہ نہیں کرنا چاہتا اور انہیں ایسے اداروں



سے بدل دیتا ہے جو کہ بیرونی ریاستوں کے مداح ہوتے ہیں۔

تاہم سب سے بڑا المیہ جو جدید ریاست کے سبب مسلم دنیا میں وارد ہوا وہ المیہ یہ عقیدہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اس کا علاج زیادہ سے زیادہ سیاست اور اس سے بھی زیادہ ریاست ہے۔

یہ نظریہ ابتداء ہی سے موجود تھا۔ انیسویں صدی میں ترکی اور دوسرے اصلاح پسندوں نے سوچا کہ مغربی طاقت کی کبھی ریاست ہے لہذا مسلم دنیا کو مضبوط بنانے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ مغربی ریاست کو روشناس کرایا جائے۔ درحقیقت جتنا زیادہ مسلمانوں نے ریاست کو متعارف کرایا اتنے ہی کمزور مسلمان سامنے آئے۔

۱۶۸۲ء میں عثمانیوں نے وینس کا محاصرہ کیا اور سارے یورپ کو خوفزدہ کر دیا۔ تنظیمات کے اختتام پر سلطنت عثمانیہ یورپ کے ایک بیمار آدمی کی مانند تھی۔ اتاترک کے بعد ترکی تقریباً اتنا ہی طاقتور تھا جتنا کہ بیچیم۔

لیکن عقیدہ جو برقرار رہا اس کی کبھی زیادہ اور اس سے بھی زیادہ ریاست تھی لہذا آپ دیکھتے ہیں کہ مغربی مطلق العنان ریاست کے نقوش جو مسلم دنیا میں قبولے گئے وہ ہٹلر اور اسٹالن کی نقل ہیں۔ صدام کے عراق سے ظاہر ہے کہ اس کی فتوحات کیا ہیں۔ ریاست کی معاشی منصوبہ بندی میں ہر جگہ پر آپ مغربی نظریات کا اثر و نفوذ دیکھ سکتے ہیں۔ ریاست معیشت کی تعمیر پر بھاری بھر کم اخراجات کر رہی ہوتی ہے نتیجہ جدید ترکی اور مصر کی معاشی تباہی ہے۔ آپ سماجی اور معاشی اصلاح کے نہ ختم ہونے والے پروگرام بھی دیکھتے ہیں۔

انیسویں صدی کی ابتداء میں عثمانی سلطنت نے مصر میں زمینی اصلاحات شروع کیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سول سروس سے منسلک افراد کو بہت بڑا منافع دیا گیا جو کہ اسے کنٹرول کر رہے تھے۔ آج اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت زیادہ دولت

ایک نہایت قلیل اقلیت یعنی سیاستدانوں، افسروں، فوجی افسروں، اور پولیس وغیرہ کے لئے مختص ہے۔

جدید ریاست کی بیماری کا ایک شمر گمراہ عوام ہے۔ وہ ترقی کا راستہ ایسی ریاست کی تشکیل میں دیکھتے ہیں جسے وہ خود کنٹرول کریں۔ یہ ریاست جدید مطلق العنانیت سے مشابہت رکھتی ہے۔ ایسی ریاست کے قیام کے لئے کوششوں کا نتیجہ ایک بھیانک تصادم اور نفرت سے بھرا ڈرانا خواب ہے جو بظاہر سب کے لئے سادہ سا ہے۔ اس کا سبب ریاست بذات خود ہے۔

مسلم دنیا میں ریاستی انقلاب کی یہ سوچ دراصل مغرب کا نظریہ ہے اور مسلم دنیا بھی اسے اپنائے ہوئے ہے اور سوچتی ہے کہ جنت حاصل کرنے کا راستہ یہی ہے کہ ریاستی کنٹرول کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور اسے مختار کل بنا دیا جائے۔ تمام قتل و غارت کا سبب یہی ہے اور اس کا سبب ریاست ہے۔

ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہئے کہ اب کوئی شخص ہجرت نہیں کر سکتا۔ ابن عربی پوری دنیا میں بغیر پاسپورٹ کی ضرورت محسوس کئے سفر کر سکتا تھا۔ آج کے مسلمان درجنوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں قید ہیں اور ان کے لئے سرحدوں سے باہر نکلنا ناممکن ہے جو مسلمان ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے ساتھ بڑا برا سلوک کیا جاتا ہے۔ سعودی عرب اور خلیج میں پاکستانیوں کو دوسرے درجے کا بھکاری تصور کیا جاتا ہے۔

عراق میں مصری مہاجر مزدوروں کو ایرانی جنگ کے اختتام پر بڑے آرام سے قتل کر دیا جاتا تھا۔ کویت میں جب ریاست نے مناسب سمجھا سیکڑوں ہزاروں فلسطینی، بنگالی اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کو کشتیوں میں بھر کر سرحدوں سے باہر چھوڑ دیا۔

مسلم دنیا میں ریاستوں کی اصل سیاست پر کاری ضرب صرف فوج اپنے



افسروں کے ذریعے لگاتی ہے پھر خفیہ پولیس کی حکمرانی مکمل سنسر شپ اور آزادی کا فقدان یہ سب کچھ ریاست کے نام پر کیا جاتا ہے، جو اس وقت مطلقاً بے بس ہوتی ہے جب کچھ کر گزرنے کی ضرورت ہو خصوصاً بوسنیا میں یہ تمام بھیانک مسائل اس وقت وارد ہوئے جب مسلمانوں نے جدید ریاست کو اپنا لیا۔ اللہ واحد کی حاکمیت اور قدیم اسلام سے لا تعلق ہو جانے پر اللہ تعالیٰ کا صلہ ہے۔

کسی حد تک مسلمانوں کے پاس کوئی دوسرا انتخاب ہی نہیں تھا۔ جب سفر مغرب نے نوآبادیاں قائم کیں تو ریاست کا پودا ان کی آزاد حکومتوں کو منہدم کر کے لگایا یوں ریاستیں قائم کی گئیں لیکن بد قسمتی سے جدت پسند، لادین اور بنیاد پرست مسلمان سب کے سب ریاست قائم کئے جانے کے پر جوش حامی رہے اور اپنے اس عمل سے وہ مغرب کی سب سے بری چیز کی نقالی کر رہے ہیں۔

بلاشبہ مغرب نے بذات خود ریاست ایجاد کی اور وہ اپنی ایجاد کے نقائص سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ نازی ازم اور کمیونزم بھی یورپ میں ایجاد ہوئے تھے لہذا پوری یورپی تاریخ میں ریاست کے خلاف رد عمل موجود ہے۔ انیسویں صدی کی آزادی پسند تحریک پوری کی پوری ریاست کے خلاف رد عمل تھی اور آج کل جہاں پیچرازم ہے وہاں لاقانونیت اور آزادی کی مکمل روایت موجود ہے۔ مغرب میں ریاست کے مسائل کا بہترین حل آزاد ریاست ہے۔

کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مغرب میں ریاست کے مسئلے کا بنیادی حل پیش کیا جا چکا ہے یہاں تک کہ صرف نظریے کی حد تک ہی۔ ہم اس زمانے میں زندہ ہیں جب قوم پرستی اور نسل پرستی ابھر رہی ہے اور ایسے مطالبے سامنے آرہے ہیں کہ اس منزل کو روکا جائے، بے روزگاری کا خاتمہ کیا جائے اور معاشرتی زوال جو کہ ریاست کا نتیجہ ہے کو روکا جائے۔ ایک آزاد ریاست، ریاستی مداخلت کو محدود اور کم کرتی ہے۔ معاشرے اور فرد کو آزادیاں واپس کرتی ہے لیکن

ریاست کے کردار کو محدود کرنے والی کوشش تا حال کامیاب نہیں ہوئیں۔ سماجی تحفظ اور صحت کی سہولتیں ہم کس طرح نئے انداز سے منظم کر سکتے ہیں۔

کون دوسرا یہ سب کچھ کرے کیوں کہ ریاست کو تو اور بہت سے کام کرنے ہیں لیکن کم از کم مغرب نے ریاست پر اعتماد کرنا سیکھ لیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے مستقبل کا راستہ بالکل واضح ہے۔ زیادہ گنہگار مسئلے جو ہمیں لاحق ہیں جدید ریاست کو اپنانے سے وارد ہوئے ہیں اس کا علاج بہر حال اللہ واحد کی حاکمیت کی طرف لوٹنا ہے تب حکومت اس قسم کی غبی ہوگی کہ وہ اس قسم کے مسئلے پیدا کرے جو کہ جدید ریاست پیدا کر رہی ہے۔

یہ مسلمانوں کے لئے ایک سبق ہے۔ گمراہ لوگ مسلمانوں کو درپیش اس خوفناک تصادم اور تباہی کا حل مزید آمریت پسند اور مطلق العنان ریاست کی طرف پیش قدمی سمجھتے ہیں جو کہ بالکل جھوٹ ہے۔

قدیم اسلام کے پاس اس کا حل ہے۔ درست راستہ یہ ہے کہ ریاست سے اپنی راہ جدا کر لی جائے اور یہ راستہ لازماً آپ کی راہنمائی اللہ واحد کی حاکمیت کی طرف کرے گا۔ اس راستے پر چلنا بہت زیادہ مشکل ہوگا بلکہ اس کو صحیح طور پر سمجھنا بھی، لیکن اس کا صلہ مسلم دنیا میں ڈراؤنے خوابوں ایسے مسائل کا خاتمہ ہوگا۔

اس سفر کے آغاز کا طریقہ صرف اتنا سا ہے کہ ہم اپنے خوبصورت رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے محبت کریں۔



# مسلم دنیا کے مسائل کا علاج

روایتی علماء کے کردار کی بحالی

گزشتہ باب میں ہم مغرب کی آمد سے پہلے مسلم معاشرے میں علماء کے اتنے اہم کردار کا ذکر کر چکے ہیں خاص طور پر استبدادیت پر پابندیاں عائد کرنے کے حوالے سے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مسلم دنیا میں مغرب کی آمد اور اس جدید ریاست کے قیام پر علماء کو کس طرح دانستہ طور پر کمزور کیا گیا باوجود اس کے کہ بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ اس باب کا مقصد علماء کی موجودہ حالت پر نظر ڈالنا اور اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ اگر علماء کا سابقہ رتبہ بحال کر دیا جائے تو مسلم دنیا کے مسائل حل ہوں گے۔

سچے علماء پیغمبر ﷺ کے نائب ہیں لیکن آج ایسے علماء بمشکل ہی ملتے ہیں۔ جو کچھ موجود ہیں وہ اس کا سایہ جو کبھی وہ ہوتے تھے یا ہونے چاہئے تھے۔ آج کل علماء بمشکل ہی کسی سیاسی قوت یا رسوخ کے مالک ہیں، اب کیا وہ کوئی حکومت بنایا گرا سکتے ہیں جیسا کہ وہ مغرب کی آمد سے پہلے بناتے اور گراتے تھے۔ علماء کے پاس تقریباً کوئی سماجی طاقت نہیں، وہ معاشی معاملات کو نہ ہی کنٹرول کر سکتے ہیں اور نہ ہی منظم تعلیم کے شعبہ میں ان کا کردار بالکل محدود ہے کیوں کہ اصل تعلیمی نظام چلانے اور اسے کنٹرول کرنے کی ذمہ داری ریاست پر ہے نہ کہ علماء پر۔ علماء کے پاس بہت کم قانونی اختیار ہے کیوں کہ بہت سارے ملکوں میں خود شریعت کی کوئی اہمیت حاصل نہیں اور اکثر اوقات شریعت کا اطلاق ریاست کی مدد میں عدالتیں کرتی ہیں نہ کہ علماء۔

علماء کے پاس دولت نہیں، وقف کا عظیم نظام بہت ساری جگہوں پر ختم کر دیا گیا ہے یا اس کا حجم کم کر دیا گیا ہے یا پھر اس کا انتظام حکومت کے محکموں کے پاس ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ علماء کا کوئی وقار نہیں۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں سلطنت عثمانیہ اور بڑی ریاستوں کے علماء پوری دنیا کے فکری راہنما تھے اور مسلم دنیا میں بڑے محترم تھے۔ آج کل کسی ایک عالم کا نام گنونا مشکل ہے جسے ہر کسی سے اس طرح کی عزت حاصل ہو۔

علماء اس برے طریقے سے زوال کا شکار ہیں کہ برطانیہ جیسے ملک میں مساجد کے امام جنہوں نے پرانے علم کی تعلیم حاصل کی ہوتی ہے مسجد کمیٹی کے ملازمین میں سے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی بھی نگرانی کی جاتی ہے۔ روپے کے عوض ان کی بھی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں اور انہیں بھی برطرف کیا جاسکتا ہے بالکل اس طرح جس طرح کہ ایک صفائی کرنے والے یا کارگر کو کیا جاسکتا ہے۔

کچھ مسلم ملکوں میں علماء کو اچھی تنخواہیں دی جاتی ہیں اور ان کی مالی معاونت کی جاتی ہے لیکن وہ ہوتے ریاستی کنٹرول میں ہیں۔ قاہرہ کی الازہر میں علماء دہائیوں سے ٹھیک وہی کچھ کر رہے ہیں جو کہ مصر کے حکمران چاہتے ہیں اور انہوں نے اسلام کو اس طرح بدل دیا ہے کہ اسلام کی ہر چیز جمال عبدالناصر، صدر سادات اور حسنی مبارک کی فرمائش کے مطابق ہو گئی ہے۔ یہ کھٹ تپتی ہیں اور وہی کچھ کرتے ہیں جو ڈور کھینچنے والا ان سے کہتا ہے۔ انہوں نے اسلام کو ازسرنو اس طرح لکھا ہے کہ جدیدیت کے لئے موزوں ہو جائے اور ہر چیز ریاست کی خواہش کے مطابق ہو جائے۔ پوری شریعت اس لئے دوبارہ لکھی گئی ہے کہ ان حصوں سے نجات حاصل کی جائے جو مغرب کے ناپسندیدہ ہیں۔

جب حکمران اشارہ کرتا ہے تو قانون کثرت ازدواج اور نظریہ جہاد سب کچھ بدل دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً ایسے علماء مسلم عوام اور سمجھ بوجھ رکھنے والے مسلمانوں



میں اپنی قدر کھو چکے ہیں۔ نتیجتاً بہت سے مسلمانوں نے اجتماعی طور پر علماء سے اپنا رخ پھیر لیا ہے اور وہ دوسرے سیاسی لیڈروں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مسجدوں کے اماموں کا اصل دنیا سے کوئی رابطہ نہیں اور ان کے ذہنوں میں کلچر کے چیلنجوں کا خیال تک نہیں۔ امام تنگ نظر ہیں اور اس قابل نہیں کہ نئے سر اٹھانے والے مسائل کے ساتھ نمٹ سکیں۔ ان کے ہاتھوں میں شریعت محدود اور غیر متعلقہ دکھائی دیتی ہے۔

چاروں فقہی امام کی پرانی شریعت اب تک کی کسی بھی تہذیب کی سب سے زیادہ شائستہ تکمیل ہے اور اب اسلامی قانون کے یہ خزانے ناپید ہو چکے ہیں کیوں کہ مخصوص قسم کے یہ امام چند اصطلاحات کی تکرار سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ان علماء کی جگہ کچھ گمراہ مغرور لوگوں نے لے لی ہے۔ وہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کچھ ایسا کرنا چاہتے ہیں جس سے انہیں قدیم علماء سے نجات مل جائے۔ دیوبندی حضرات ایسے امام پیدا کر رہے ہیں جو بڑے قابل رحم اور تنگ نظر ہیں، تبلیغی جماعت بھی کچھ اس سے مختلف نہیں کرتی، وہ کسی بھی جاہل آدمی کو لیکچر دینے کی اجازت دے دیتے ہیں، جس نے صرف ”تبلیغی نصاب“ کا مطالعہ کیا ہوتا ہے جب کہ وہ ظاہر یہ کرتا ہے کہ اسلام کے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔

مودودی اور اس کی جماعت علماء سے خاص طور نفرت کرتی ہے جسے اس کی رطب دیا بس بھری تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے، وہ علماء کو برطرف کر کے ان کی جگہ پر اپنی سیاسی پارٹی کے افراد کا تقرر کرتے ہیں۔ مودودی، حسن البنا اور ان جیسے دوسرے افراد کی برپا کردہ بنیاد پرست تحریکوں نے علماء سے چھٹکارہ حاصل کر لیا ہے اور ان کی جگہ نئے اسلام پسند دانشوروں نے لے لی ہے۔

آپ انہیں ہر مسجد میں دیکھ سکتے ہیں، انہوں نے عام طور پر مغربی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ادنیٰ قسم کی تعلیم حاصل کی ہوتی ہے۔ وہ مودودی کی کتابوں

کے علاوہ اسلام کی کسی چیز سے واقف نہیں ہوتے۔ انہوں نے اسلام کی رسمی یا غیر رسمی تعلیم حاصل نہیں کی ہوتی اور یہ بڑے خود آموز مغرور ہیں۔ وہ دن بھر بحث مباحثے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے، وہ شریعت کے بعض حصوں کو نا فہمیدہ، کمیونسٹ اور نازی خیالات کے متذبذب ملغوبے کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں کو جن کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے اور میلاد النبی ﷺ مناتے ہیں نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

اپنی دانشوری کے دعویداروں نے علماء کی جگہ لے لی ہے، ان لوگوں کی تعلیم اسلام کے حوالے سے کمزور ہے اور وہ اسے اپنا حق سمجھتے ہیں کہ ان غریب لوگوں پر حملہ آور ہوں اور انہیں رد کرتے چلے جائیں۔ جنہیں بیٹھنا پڑتا ہے اور بہت سارا کمیونزم سننا پڑتا ہے جسے یہ گمراہ قائد اپنی تازہ ترین دانشوری کے طور پر پیش کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اجتہاد کر رہے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام میں متبہدی تھے اور ان کا موازنہ اپنی حیرت انگیز شخصیت سے کرتے ہیں۔

یہ باب پرانے علماء کے متعلق بحث کرتا ہے لیکن قاری کہہ سکتا ہے کہ ایسا اس وقت کیا جا رہا ہے جب پرانے برے وقت سے گزر رہے ہیں۔ شیعہ علماء کو یقیناً کبھی بھی زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی، مگر اب ایران پر حکومت کر رہے ہیں۔ ایران میں شاہ کی حکومت گر جانے کے بعد انقلاب آیا۔ اس انقلاب کے دوران بہت سے لوگ اقتدار کے لئے لڑے، اسلامی بنیاد پرستی کو فتح ہوئی۔ لیکن بنیاد پرست منقسم ہو گئے۔ ایک طرف مجاہدین تھے جو کہ ایک بنیاد پرست گروہ تھا ہر لحاظ سے مودودی اور حسن البنا کی طرز کا انقلاب لانا چاہتے۔ لیکن وہ خود کو اقتدار میں رکھنا چاہتے تھے اور مجاہدین کو اقتدار دینے کے خلاف تھے۔ علماء جیت گئے، ایران علماء نے بنیاد پرست مجاہدین سے فتح کو چرا لیا۔



تاہم ایرانی انقلاب نے شیعہ علماء کو اقتدار میں نہیں رکھا، اس کے بجائے نئی طرز کے عالم اقتدار میں آئے جو کہ روایتی شیعہ علماء سے بالکل مختلف تھے۔ روایتی علماء نے بلاشبہ حصول اقتدار کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اثنا عشری شیعہ علماء کا کردار روہی ہے جو کہ قدیم اسلام میں علماء کا ہے یعنی حکمرانوں کے اختیارات محدود کرنا اور ان کی نگرانی کرنا نہ کہ خود حکمرانی کرنا بلکہ ایک قانونی اور سماجی کردار ادا کرنا۔ ان روایتی علماء نے علماء کی حکمرانی (ملا راج) کا نظریہ شروع ہی سے مسترد کر دیا تھا اور غیبتی کی حکومت میں کوئی منصب قبول کرنے سے منع کر دیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر انہیں ایک طرف ڈھکیل دیا گیا اور ان کی جگہ پر ایک نئے قسم کے علماء نے قبضہ کر لیا۔

ایران میں علماء مر رہے ہیں، ان کے بجائے ایک نئے طرز کے عالم ابھر رہے ہیں جو کہ ہر حوالے سے مودودی، حسن البنا اور قطب شہید سے مشابہت رکھتے ہیں، یہ نئے علماء روایتی علماء جیسے دکھائی دیتے ہیں، لیکن درحقیقت ان سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ وہ اصل شیعیت کو تباہ کر رہے ہیں اور ان کی جگہ نیم کمیونسٹ خیالات کو رواج دیکر مودودی کے انداز میں سامنے آرہے ہیں۔ علماء ہر جگہ پر مر رہے ہیں خاص طور پر ایران میں جہاں بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اقتدار میں ہیں۔ علماء کے زوال کے کئی اسباب ہیں اور بالکل عیاں۔ مغرب نے علماء کو دیوار سے لگایا دیا ہے۔ جیسا کہ مغرب نوازوں اور جدت سازوں نے کیا اور وہ مسلم دنیا میں ایک نمائش کے لئے ہر جگہ پر علماء کو ایک طرف ہٹا رہے ہیں، اور بنیاد پرست اپنی مطلق العنان سیاسی جماعتیں اور ریاست قائم نہیں کر سکتے اگر علماء زندہ رہیں اور پھیلیں پھولیں۔

علماء کو ایک طرف کر دیا گیا کیوں کہ کچھ لوگ مسلمانوں کو لوٹ لینا چاہتے تھے، انہیں قابو میں رکھنا چاہتے تھے اور ان پر غلبہ کرنا چاہتے تھے مگر وہ نہیں کر سکتے

تھے جب تک کہ علماء سے چھٹکارہ نہ حاصل کر لیتے۔ علماء کے زوال کے اثرات بہت زیادہ بھی ہیں اور بہت گہرے بھی، مسلمانوں کو درپیش جملہ گنہگار مسائل علماء کے زوال کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ علماء زوال زدہ ہیں لہذا مسلم دنیا کی حکومتیں جابرانہ، استبدادانہ اور خود غرض ہیں۔

کوئی ایسا نہیں جو انہیں باز رکھ سکے، بنیاد پرست تحریکوں کی جدوجہد کے باعث معرض وجود میں آنے والی حکومتیں آمرانہ اور مطلق العنان ہوں گی کیوں کہ علماء کو اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ ان پر پابندیاں عائد کر سکیں۔ ایسے تمام راہنما جو اجتہاد کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اپنے اقتدار پر روک لگانے کی اجازت نہیں دیں گے تاکہ وہ ٹھیک وہ کچھ کر سکیں جو انہیں پسند ہے۔ بنیاد پرست دانشور جماعت یا ریاست کو اس طرح نہیں روک سکتے جس طرح کہ علماء روکتے تھے۔ کیوں کہ وہ بذات خود پارٹی کا ایک وفادار رکن ہے اور ریاست کا ایک عملدار اور اس نے جماعت اور ریاست کے لیڈر کو غیر مشروط وفاداری کا حلف دیا ہوتا ہے۔ بلاشبہ ایسی حکومتوں پر شریعت کی کوئی روک نہیں ہوگی کیوں کہ وہ بذات خود شریعت کو اپنی پسند کے مطابق بدلنے کے حق کا دعویٰ رکھتے ہیں، کیوں کہ وہ اجتہاد کرنے کے قابل ہیں۔

مسلمان اقتدار کے بھوکے افراد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ تمام مسلم دنیا میں حکومتیں ہیں، راہنما اور تحریکیں ہیں جن کا مطمح نظر اقتدار ہے اور ان کا مقصد پوری مسلم دنیا کا لیڈر بننا ہے۔ وہ سب خود کو امیر المومنین کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہاں پورے گروہ ہیں جو امیر المومنین بننا چاہتے ہیں۔ اقتدار کی اس پیاس کا سبب علماء کی عدم موجودگی ہے، ایسے اہل اور پر وقار علماء جو کھلے عام بتا دیں کہ اقتدار کے پیاسے ہیں کیا؟ لالچی اور بے رحم انسان!

بہت سارے مسلمان مغربی تمدن کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی شکایت کرتے



ہیں جو کہ ایک طوفانی سوچ کی طرح مسلمانوں بلکہ مسلم دنیا کو بہاتا جا رہا ہے۔ بہت سارے مسلمان نئے تمدن، سائنس اور سماجی مسائل کے مقابلے میں اسلام کا دفاع کرتے ہوئے خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں۔ اس مسئلے کا سب سے بڑا سبب علماء کا زوال ہے۔

ان چیلنجوں سے نمٹنے کے لئے نہایت اعلیٰ قسم کی تعلیم اور فراست درکار ہے۔ اس عہد میں اسلام کے دفاع اور اس کے مستقبل کے لائحہ عمل کی منصوبہ بندی کے حوالے سے برتر ذہانت کے حامل افراد کی ضرورت ہے۔ آج کل اس معیار کے افراد آسانی سے دستیاب نہیں، امام غزالی ایسا عالم جو کہ غالباً اپنے عہد میں دنیا بھر میں سب سے بڑا مفکر تھا، یورپ نے فلسفہ ان سے سیکھا، آج ان جیسا کون ہے؟ مسجدوں کے روایتی امام اپنا کام خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ علماء کی ناکامی اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ امام غزالی اور امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہما کے مرتبے کے لوگ ایک وسیع اور نہایت مہنگے اسلامی نظام تعلیم کے بغیر پیدا نہیں کئے جاسکتے۔

یورپ کی آمد سے پہلے کے دور میں اسلامی یونیورسٹیاں جیسا کہ بغداد کی جامعہ نظامیہ اور الازہر، آکسفورڈ، کیمبرج اور عربوں کے برابر کی یونیورسٹیاں تھیں بلکہ ان سے بھی بہتر۔ آپ ایک معقول اسلامی نظام تعلیم کے بغیر امام غزالی اور احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہما جیسے افراد پیدا کرنے کی توقع نہیں کر سکتے۔

کسی بھی تہذیب یا تمدن کی کنجی یا کسی بھی کامیاب قوم کی کلید اس کے اعلیٰ معیار کے مفکر ہیں۔ مغرب نیوٹن، ڈارون، مارکس اور آئن سٹائن ایسے لوگوں کے باعث عظیم بنا ہے۔ مسلم دنیا صرف اس قیمت پر دوبارہ عظیم بن سکتی ہے جب ہمارے پاس امام غزالی اور امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہما جیسے افراد ہوں۔

صحیح علماء کے بغیر ایک صحیح گروہ یا معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔ ایک صحیح

معاشرے کو تمدن اور آرٹ کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس سبب سے بڑھ کر ایک انتہائی شائستہ قانون اور عدالتی ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماضی میں علماء ہی یہ چیزیں مرتب کرتے تھے۔ یہ مسلم معاشرے میں پھیل جاتے اور مسلمانوں کی عملی اور فکری راہنمائی کرتے ہوتے، اسلام کی زندگی کے ہر شعبے میں حکمرانی قائم کرتے۔ معاشرہ اس صورت میں پیش قدمی کر سکتا ہے اگر راہنمائی کرتے رہیں۔ موجودہ علماء بمشکل ہی وہ ذہنی تقاضے نبھا سکتے ہیں جو ان پر واجب ہیں یا پھر خود ساختہ ماہرین فن اور بنیاد پرست دانشور انہیں کرنے میں لگا دیتے ہیں جو بظاہر آرٹ اور کچھ کوتاہ کرنے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔

شریعت کے بارے میں انکا خیال یہ ہے کہ سیاسی جماعت جس کے وہ پیروکار ہیں جو چاہے وہی کر سکتی ہے۔ جب کبھی کوئی مسلمان کسی اسلام دشمن کے چیلنج کا جواب دیتے وقت اپنی زبان کو گنگ پاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے کافی پڑھے لکھے علماء نہیں ہیں جو اس کا معقول جواب دے سکیں۔ اسلام کے دفاع کے لئے اعلیٰ معیار کے علماء ضروری ہیں تاکہ وہ ان حملوں کو روک سکیں۔

مسلم دنیا کا ایک اور خوفناک مسئلہ جس سے کہ ہر مسلمان آگاہ ہے خوفناک فرقہ پرستی کی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ یہ علماء کی کمزوری ہے کہ ایسا کچھ ہو رہا ہے۔ مغرب کی آمد سے قبل مسلم سرزمین پر علماء کا ایک ایسا گروہ تھا جسے اتنا اختیار اور وقار حاصل تھا کہ وہ کسی بھی اٹھنے والی بحث کا خاتمہ کر سکتا تھا اور کوئی دو ٹوک فیصلہ سناسکتا تھا جسے قبول کر لیا جاتا۔ اسلام اور مسلمان دونوں چین سے تھے۔ آج کل ہر گمراہ مسلمان خود کو اس قابل محسوس کرتا ہے کہ کسی معمولی سی بات پر کوئی تازہ کھڑا کر دے۔

اب صرف یہ نہیں کہ علماء نہیں ہیں بلکہ وہ اتنے پروقار بھی نہیں کہ کسی بحث کا اتمام کر سکیں۔ فتنے کو ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مسلم دنیا پر قانونیت کی حکمرانی



ہے۔ سیکولر عملدار اس صورت حال کو بغیر سوچے سمجھے ٹانگ اڑا کر مزید پر اگندہ کر دیتے ہیں۔ وہ ایسے کہ علماء کا ایک ایسا گروہ ہونا چاہئے جو اس میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ علماء پیغمبر ﷺ کے وارث ہیں اور مسلمانوں کے راہنما۔ علماء کے بغیر مسلمانوں کی مثال بھٹکے ہوئے آوارہ گرد کی طرح ہے۔ صحیح علماء کے بغیر مسلمان ایسے ہی ہیں جیسا کہ بے یار مددگار چھوڑ دیئے گئے لوگ۔

ان تمام مسائل کا حل علماء کا احیاء ہے، آمرانہ اور مطلق العنان حکومتیں روک دی جائیں گی، مغربی کلچر مسترد کر دیا جائے گا، مسلم کلچر اور معاشرہ مضبوط ہوگا، مسلمانوں کے باہمی تکرار خاموش ہو جائیں گے، اسلام اور مسلمان دوبارہ سر بلند ہوں گے۔

یہ کہنا آسان ہے کہ علماء کو کس طرح بحال کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے سب سے زیادہ ضرورت علماء کی تعلیم پر روپیہ پیسہ خرچ کرنے اور ان کی جدید اصولوں پر تربیت کے لئے کوئی مناسب نظام تربیت دینے کی ہے۔ جب اس اہلیت کے حامل علماء سامنے آئیں گے جو واقعتاً مسلمانوں کو درپیش مشکل مسائل کا حل پیش کر سکیں گے، تو علماء کو لازماً عزت دی جائے گی اور مسلمانوں کی تائید انہیں اس قابل بنادے گی کہ وہ اپنا کردار ادا کر سکیں۔

علماء کو خاص طور پر معاشی آزادی فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ مغرب کی آمد سے قبل علماء کے پاس وقف کا نظام تھا جسے وہ بذات خود کنٹرول کرتے تھے۔ آج کل عالم کی حیثیت صرف مسجد کمیٹی، حکومتی یونیورسٹی یا اس کے متوازی کسی ادارے کے ملازم کی ہے۔ علماء کو بہر صورت جلد اپنی رقم، دولت اور اداروں کے حوالے سے مکمل خود مختار ہونا ہوگا، تبھی وہ مسلمانوں کے سچے رہنما اور چیمپین بن سکتے ہیں۔

سب سے پہلے علماء کو ایسے لوگوں میں شامل ہونا ہوگا جو کہ غیر مسلم اداروں

میں تعلیم مکمل کر چکے ہوں گے۔ اس کام کے آغاز سے سب سے موزوں مقام برطانیہ سے جہاں اعلیٰ درجوں تک عمدہ آزاد ریاستی نظام تعلیم ہے۔ ہمیں حتمی تسلیم کرنا ہوگا کہ علماء خصوصی مدرسوں اور مسجدوں سے ملحق جامعات سے آتے تھے۔ لیکن ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ عالم کی روایتی تعلیم کے دوران جب وہ کسی مدرسہ میں اسلامی علوم کے سلسلہ میں زیر تعلیم ہوتے تھے تو دوسرے مضامین بھی جنہیں وہ پسند کرتے تھے پڑھتے ہوتے تھے، بڑے علماء زندگی بھر کے طالب علم ہوتے تھے اور وہ اہمیت کی حامل ہر چیز پڑھتے اور سیکھتے تھے، وہ الا از ہر جیسی مسجد سے اپنی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد بھی اپنی تعلیم کو مکمل خیال نہیں کرتے تھے۔

بلاشبہ یہاں پہلے ہی بہت سارے لوگ ہیں جنہوں نے عالم کی تربیت حاصل کی ہوتی ہے، ان کے لئے کلیدی بات یہ ہے کہ ان کے معیار کو اعلیٰ پیمانے تک پہنچایا جائے۔ اگر آج امام کی حیثیت پر امری اسکول کے استاد کی سی ہے، تو انہیں بہر صورت اتنا ابھرنا ہوگا کہ کیمبرج کے پروفیسر کے معیار کو پہنچ جائیں۔ عالم کی تعلیم اسلامی روایات کے انتہائی قیمتی خزانے کی بحالی کی کلید ہے۔ نئے کو علماء کو چاروں فقہوں پر مکمل دسترس ہونی چاہئے اور انہیں اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ اس پورے شرعی نظام کی اصل کارکردگی پر نظر رکھے ہوئے ہوں جو کہ مغرب کی آمد سے پہلے موجود تھا۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ شریعت کی چاروں فقہوں کے ارتقاء کی مکمل تاریخ اپنی ابتداء سے لیکر مغرب کی آمد تک ان کے علم میں ہو۔

اتنا بڑا قانونی علم ان سوالوں کے جواب کے سلسلے میں جو ہمیں آج کل درپیش ہیں سونے کی کان ثابت ہوگا اور خاص طور پر وہ طریق کار جو ان سوالوں کا جواب دینے میں استعمال ہوگا۔ سب سے بڑھ کر ہمیں لازماً تمام نقائص دور



کرنے ہوں گے۔

تبلیغی جماعت جن کے پاس پڑھتے کے لئے صرف ایک کتاب ہے اور مودودی کے پیروکار جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اسلام سے واقف ہیں ان پر بہر صورت یہ واضح کرنا ہوگا کہ وہ کتنا کم جانتے ہیں، شاید وہ پرانے اسلام کی طرف راغب ہوں اور عظیم عالم بن جائیں۔ اس میں انکا کوئی قصور نہیں کہ وہ تبلیغی جماعت اور مودودی کے دور میں پیدا ہوتے ہیں۔

آخری مقصد علماء کی ایک فصل تیار کرنا ہے جن کے پاس مدرسوں اور مساجد سے ملحق جامعات کا جال ہو، جہاں خود مختار مالیات اور نشر و اشاعت کی تمام سہولتیں موجود ہوں۔ اسلام ایک عالمگیر معاشرہ ہے۔ اگر اس قسم کے علماء کی ایک جماعت ملک میں درست صورت میں موجود ہو تو یہ کافی ہوگی۔ کیوں کہ بہت زیادہ مسائل جواب درپیش ہیں دنیا کے تمام ملکوں میں ہیں۔ پس ان علماء کی قیادت اور نصیحت پوری دنیا کے لئے موثر ہوگی نہ کہ صرف برطانیہ کے لئے۔

اپنی جد جہد میں تقلید کے لئے ایک عمدہ نمونہ امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو ان کے نمونے پڑ ڈھال سکیں تو ہم یقیناً علماء کو بحال کر لیں گے اور مسلم دنیا کے مسائل حل کر لیں گے۔ اگر ایک دن علماء دوبارہ ابھرے (انشاء اللہ) تو ایک نیا عہد طلوع ہوگا، نیا سنہری عہد، اسلامی عہد، ایک نئی دنیا جس میں اسلام اپنا درست مقام حاصل کرے گا۔

﴿پانچواں باب﴾

## کیا اسلام مطلق العنان ہے؟

(میں نے کچھ عرصہ قبل لندن میں اسلام کے موضوع پر ایک لیکچر دیا اور اس بات کی نشاندہی کی کہ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اور اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ پوری دنیا کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری واجب ہے۔ تب مجھ سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا اسلام مطلق العنان ہے۔ اس باب میں اسی سوال کا جواب دینا ہے)

مطلق العنانیت بلاشبہ صرف یہی نہیں کرتی کہ آپ کی زندگی کو ایک مخصوص مجموعہ قوانین کے تحت چلاتی ہے بلکہ بہت سارے لوگ ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ مطلق العنانیت یہ ہے کہ زندگی کے جملہ امور کو مکمل طور پر ریاست کے ذریعے سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اپنی گرفت میں رکھا جائے۔

پس مطلق العنانیت سے مراد ایسا معاشرہ ہے جہاں سب کو ایک ہی حکم کی تعمیل اور تائید کرنی ہے اور وہ ہے ریاست کا حکم۔ مطلق العنانیت میں گونا گونی نہیں ہوتی بلکہ ایک سخت قسم کی جامدیت ہوتی ہے۔ گونا گونی کسی بھی صورت میں خواہ رائے کی گونا گونی یا ذائقہ کی یا پھر لباس کی ممنوع ہے۔ کثرت (معاشریت میں بقلمونی) غیر قانونی ہے۔ سب سے بڑھ کر مطلق العنانیت کا مطلب یہ ہے کہ شخص کو بذریعہ پولیس قابو میں رکھا جائے اور ایسی پولیس اسٹیٹ بے مزہ ہوتی ہے۔

مطلق العنان ریاستیں جو کہ بیسویں صدی میں موجود تھیں ان میں اسٹالن کا



روس اور ہٹلر کی جرمنی بھی شامل ہے اور ادب میں انتہا کی مکمل مطلق العنان ریاست بلاشبہ جارج اول کی ہے جو اس نے اپنے ناول ۱۹۸۴ء میں بیان کی ہے۔ مطلق العنانیت جدید دنیا کی انتہا کی ناپسندیدہ خصوصیت ہے۔ اس سے بڑی صورت حال کیا ہو سکتی ہے کہ پولیس ہماری زندگی کے ہر شعبے کو روند ڈالے۔ پس یہ بات قطعاً خطرناک ہوگی اگر اسلام کسی بھی حوالے سے مطلق العنان ہو۔ لیکن ہمیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، قدیم اسلام کسی بھی حوالے سے مطلق العنان نہیں ہے۔ قدیم اسلام ایک سچا مذہب ہے اور اصلی اسلام ہے۔ اسلام کسی بھی حوالے سے مطلق العنان نہیں۔ یہ بات کئی طریقوں سے ثابت کی جاسکتی ہے۔

مطلق العنانیت کی کبھی بذات خود ریاست اور اس کا پوجا جانا ہے۔ پچھلے باب میں یہ بات عیاں کر چکا ہوں کہ ریاست مغرب کی تازہ ایجاد ہے اور اسلام میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ میں اپنے قاری کی توجہ ان ابواب کی طرف مبذول کر اؤں گا۔ قدیم اسلام اپنے اندر ریاست کی پوجا کے آغاز کی گنجائش نہیں رکھتا۔ قدیم اسلام میں حکمران کے پاس مذہب کے حوالے سے کوئی کردار نہیں جو وہ ادا کرے۔ وہ ایک سیاسی شخصیت ہے اور اسے کسی بھی حوالے سے خدا کی طرف سے مقرر کردہ تصور نہیں کیا جاتا جیسا کہ مغرب کے بادشاہ تصور کئے جاتے ہیں۔ سماوی حق شاہی کے عقیدے کی ابتدا مغرب سے ہوئی تھی جس کی تازہ شکل ریاست کی پوجا ہے۔ مسلمان حکمران قانون کے تابع ہے یعنی شریعت کے تابع اور علماء بہت سارے طریقوں سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ اسلام میں کسی ایسی چیز کا وجود نہیں جو ریاست کی طرح قانون سے مکمل طور پر بالا ہو اور جو وہ چاہے کرتی جائے، خود پست پر ایک ہی آمر حکمران ہو اور اسے خدا کے برابر تصور کیا جائے۔

اسلام میں مسلمانوں کے اصل رہنما علماء اور اولیاء ہیں۔ لیکن ان کے پاس براہ راست کوئی سیاسی طاقت نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ کوئی رجعت پسند حکومت بناتے ہیں۔ اسلام میں کوئی پادریت نہیں ہے البتہ علماء اور اولیاء سے محبت اور ان کی عزت کی جاتی ہے مسلمان خود اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ کس کی پیروی کریں گے۔ مغرب میں مطلق العنانیت کی ایک جز کیتھولک کلیسا ہیں اپنی بادشاہی کے ساتھ جس میں پوپ کے لئے مکمل اطاعت لازم تھی۔ اسلام میں کوئی پوپ نہیں ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی قوت کبھی بھی مطلق العنانیت کی صورت نہیں اختیار کر سکتی تھی کیوں کہ اختیارات مقامی سطح تک منقسم ہیں۔ وہاں کوئی اسلامی اسٹالن یا ہٹلر نہیں جو ایک مطلق العنان ریاست قائم کرے کیوں کہ قدیم اسلام میں سیاسی اختیارات کسی بھی طرح کسی ایک شخص کے ہاتھ میں مرکوز نہیں کئے جاسکتے۔

لیکن بلاشبہ قدیم اسلام میں شریعت حکمران ہے، سلطان اور علماء واقعی شریعت کو نافذ کرتے ہیں اگرچہ وہ ایک ایسے سیاسی نظام کے ذریعے کرتے ہیں جس میں اختیارات چٹائی سطح تک منقسم ہوتے ہیں۔ لہذا ہم سوال کر سکتے ہیں کہ کیا شریعت بذات خود مطلق العنان ہے؟ کیا یہ زندگی کے ہر پہلو تک دسترس رکھتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا مطلق العنان ہے؟

اس کا جواب مختصر ہے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کئی حوالوں سے مطلق العنان ہے یا تو وہ قدیم اسلامی شریعت سے واقف نہیں یا پھر ان کے پیش نظر کوئی اور شریعت ہے کہ نہ مسلمانوں کی قدیم شریعت۔

پرانی شریعت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مسلمان مرد یا خواتین اسے خود اپنے اوپر نافذ کرتے ہیں۔ ہم خود اس کو یقینی بناتے ہیں کہ اس کے تابع فرمان



رہیں گے۔ ہم اس کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جیسے کہ خود پسند کرتے ہیں، اور قدیم شریعت میں فقہ کے چار اسکول ہیں۔ ہمیں ان میں سے کوئی ایک اسکول پسند کرنا ہوتا ہے اور پھر خاص طور پر اسکے ساتھ جڑ جانا ہوتا ہے۔ ثانیاً شریعت میں کچھ فرض (ایسے کام جنہیں صورت کرنا ہوتا ہے) اور کچھ حرام (ایسے کام جن سے ہر صورت اجتناب کرنا ہوتا ہے) بہت سارے کام جن کے کرنے کی توقع ایک مسلمان سے کی جاتی ہے فرض نہیں ہیں۔

یہاں تک کہ نماز اور وضو میں بہت سے کام جو کئے جاتے ہیں، ان میں سے صرف چند فرض ہیں اور باقی ماندہ سنتیں اس طرح بلاشبہ بہت سی رکعتیں سنت اور نفل ہیں نہ کہ فرض۔ پس کس طرح بہت سی چیزوں کو بذریعہ طاقت لاگو کیا جاسکتا ہے، جبکہ ان میں سے بہت سی چیزیں فرض نہیں ہیں۔

اسلامی زندگی کا ایک وسیع حصہ احکامات اور ممنوعات پر مشتمل ہے جو کہ نہ تو فرض ہی ہیں اور نہ ہی حرام، نظریہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں سب کو وہ کام کرنے پر مجبور کرنا چاہئے۔ نظریہ یہ ہے کہ جیسے جیسے ہم بہتر اور زیادہ مذہبی ہوتے ہیں کہ ہمیں وہ کام کرنے چاہئیں جو سنت ہوں اور ایسے کاموں سے پرہیز کرنی چاہئے جو کہ حرام نہیں لیکن مکروہ ہوتی ہے۔

اسلامی زندگی میں ایک دو ٹوک قلیل مقدار معین ہے جو ہر صورت اور ہمیشہ کرنی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقی اسلامی زندگی میں بہت سارے کالم ایسے ہیں جو ان چند فرائض کے علاوہ ہیں جنہیں ہم مطلق العنانیت کے مشابہ رکھتے ہیں بلاشبہ چاروں فقہوں کے درمیان اختلافات کا مفصل علم اور فرائض اور حرام کا مکمل احوال جدت پسندوں اور بنیاد پرستوں کے قدیم اسلام پر حالیہ برسوں میں کئے گئے حملوں کے سبب تباہ ہو گیا ہے۔ ایسے علوم کا احیاء مسلمانوں کو درپیش بہت

سارے مسائل کا حل پیش کرے گا اور حل کے متلاشی آج کل کے مسلمان اپنی زندگیاں آراستہ کریں گے۔

ثالثاً صرف ہم خود ہی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم شریعت کے کتنے احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں۔ کوئی دوسرا کس طرح یہ معلوم کر سکتا ہے کہ فلاں شخص پانچویں وقت نماز پڑھ رہا ہے؟ کوئی دوسرا شخص کس طرح یہ معلوم کر سکتا ہے کہ فلاں روزے سے ہے؟ یہاں تک کہ ہم ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھتے ہیں ہم کس طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کا وضو ہے یا نہیں؟ اس سب سے بڑھ کر ہم کیسے واقف ہو سکتے ہیں کہ فلاں شخص کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر واقعی ایمان ہے؟ نیک اور بد اعمال کی بڑی وسیع تعداد ایسی ہے جن کے بارے میں صرف ہم ہی فیصلہ دے سکتے ہیں کہ ہم ان پر عمل کر رہے ہیں یا ان سے اجتناب کر رہے ہیں۔

امام غزالی نے منافقت کے موضوع پر لکھا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ بہت سارے لوگ دولت اور شہرت اکٹھی کرنے کے لئے مذہبی بن جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ مسجد میں نماز پڑھنے اس لئے جاتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھیں ایسے منافقین ڈھونڈے جاسکتے ہیں مثلاً اگر وہ خود کو عوامی جگہوں پر تخیل کی نسبت لمبی رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں یا پھر عوام میں تازہ وضو کئے بغیر نماز پڑھتے ہیں تاکہ تحسین حاصل کر سکیں۔

امام غزالی کا خیال یہ ہے کہ زیادہ مذہبی دکھائی دینے سے پرہیز کرنا چاہئے کیوں کہ یہ چیز دل کو خود ستائی، فرضی دولت اور منافقت کے زہر سے آلودہ کرتی ہے۔ لہذا لوگوں کو شریعت کی تعمیل پر مجبور کرنا ان کا خاتمہ ڈھیروں منافقت کے ساتھ کرنا ہے۔ وہ لوگ جو شریعت کی تعمیل کرتے صاف دکھائی دیں ان کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ وہ منافق ہوں گے، کسی بھی قسم کے ایمان کے



بغیر، لہذا ایک مطلق العنان پولیس فورس کے پاس کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیوں کہ مذہب کی بیرونی نمود و نمائش کے لئے لوگوں کو مجبور کرنا ایک بے معنی فعل ہے۔

قدیم اسلام میں کسی بھی شخص سے کسی بھی حوالے سے انتہائی مذہبی زندگی کی توقع نہیں کی جاتی۔ بچوں کو بہت سارے مذہبی فرائض اور قوانین سے معافی حاصل ہے۔

خواتین بہت سارے مذہبی فرائض سے مبرا ہیں۔ عام لوگوں کو کم از کم احکامات پر استثناء کی اجازت ہے۔ ٹھیک خدمت اور مذہبی زندگی کا تقاضا بزرگ افراد سے یا پھر مذہبی حوالے سے برتر طبقے یعنی علماء اور اولیاء سے کیا جاتا ہے۔ مذہبی زندگی ان لوگوں کے لئے ہے جو اسے پسند کریں اور زیادہ لوگوں سے اس بارے میں زیادہ توقع نہیں رکھی جاتی۔ نوجوان اور خواتین خاص طور پر آزاد زندگی بسر کرتے ہیں بغیر اپنے اوپر سخت زندگی مسلط کرنے کی کوشش کے۔

قدیم اسلام میں ایک عملدار ہوتا تھا جس پر نیک کاموں کی انجام دہی کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ یہ محتسب کہلاتا تھا، یہ ایک چھوٹا سا عملدار تھا جو ناپ تول کی نگرانی کرتا تھا، فرضوں کی ادائیگی اور اس قسم کے دوسرے معمولی معاملات کی نگہداشت کرتا تھا۔

محتسب کوئی خفیہ پولیس یا اہلکار نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ کسی گاؤں کے چوکیدار سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا۔ اسے جمعہ کی ادائے گی کو یقینی بنانا ہوتا تھا لیکن یہ ان لوگوں کو صرف تنبیہ کر سکتا تھا جو مسجد کا رخ نہیں کرتے تھے۔ یہ ان لوگوں کے خلاف راست اقدام کر سکتا تھا جو مذہبی قانون کی خلاف ورزی کرتے مثال کے طور پر رمضان میں کھلے عام کھاتے پیتے۔

لیکن یہ محض شک کی بنیاد پر کسی کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا تھا اور قدم اٹھانے سے پہلے اسے پوچھنا ہوتا تھا کہ قانون کی خلاف ورزی کیوں کی گئی؟ اسے مرد اور خواتین کی مخلوط عوامی محفلوں کو رد کرنا ہوتا تھا۔ وہ کھلے عام شراب نوشی کو روکتا، موسیقی، کھیلوں اور کھلونوں پر کڑی نظر رکھتا۔ لیکن یہاں ہمیں ایک چیز مد نظر رکھنی چاہئے کہ وہ صرف اس چیز کے خلاف قدم اٹھا سکتا تھا جو کھلے عام دیکھی جاسکتی تھی۔ اسے بند دروازوں کے پیچھے جانے کا اختیار نہیں تھا۔

وہ حقیقتاً ایک زیادہ مشفق بزرگ اور شریف النفس انسان تھا جسے صرف اتنا یقینی بنانا ہوتا تھا کہ کہیں نوجوان اور احمق لوگ اپنی حدوں سے باہر نہ ہو جائیں۔ اس کے دوسرے فرائض میں اس امر کو یقینی بنانا بھی شامل تھا کہ طالب علموں کو زیادہ نہ پیٹا جائے نوکروں اور جانوروں پر ظلم نہ کیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کوئی گھر کسی دوسری گھر کی رازداری یا اعمال نہ کرے اور اس طرح کی کئی دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں۔

قدیم اسلام میں مسلمان آزاد ہے، وہ اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق بسر کرتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا ہوتا کہ وہ کھلے بندوں کسی فرد یا معاشرے کے خلاف جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ قدیم اسلام میں معاشرہ آزاد ہے، قدیم اسلام میں قانون یہ ہے کہ معاشرے کا اتفاق بذات خود قانون بدل سکتا ہے۔ معاشرہ بذات خود ایک مقدس چیز ہے۔ کوئی چیز مسلم معاشرے میں وسیع پیمانے پر قبولیت حاصل کر جائے تو علماء زیادہ دیر تک اسے ممنوع قرار نہیں دے سکتے۔ یہ اس طرح ہوا کہ تمباکو اور کافی مسلم دنیا میں مقبولیت اختیار کر گئی۔ جب کافی اور تمباکو پہلی بار سامنے آئے تو الکحل کی مانند دونوں کے نشہ آور ہونے کے سبب مذمت کی گئی اور ان کو سختی کے ساتھ دبا یا گیا۔



استنبول کی بندرگاہ پر کافی سے لدی ہوئی ایک کشتی کو ایک عملدار کے حکم سے ڈبو دیا گیا، لیکن جب تمباکو اور کافی کی عادت بہت زیادہ عام ہو گئی اور مسلمانوں نے اسے قبول کر لیا تو علماء نے بھی اس کی اجازت دے دی۔ اسلام میں معاشرے کی عمومی رائے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، یہاں مطلق العنانی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

اب تک ہم صرف مسلمانوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، لیکن قدیم اسلامی معاشرے میں مذہبی رنگارنگی کی اجازت ہے۔ دوسرے تمام مذاہب سے رواداری برتی جاتی ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کو اپنا وجود برقرار رکھنے کی پھر پور آزادی ہے اور وہ اپنے آپ کو بطور ایک مذہبی گروہ منظم کر سکتے ہیں۔ ان کی اپنی قیادت ہوتی ہے، اپنے قوانین اور اپنی مذہبی انجمنیں ہوتی ہیں، اسلام میں بھی بہت سارے فرقے ہیں اور وہ بہت سارے فرقے باہم رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

لہذا مسلم معاشرہ ایک ایسا مقام ہے جہاں وسیع پیمانے پر مذہبی اور تمدنی رنگ رنگی پائی جاتی ہے اور جہاں ایک حد کے کچھ اور آرٹ کو پنپنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں نسلی قبائلی اور ہر قومی اختلافات کو ابھرنے کی اجازت ہے، قبائلی قوانین اور ذاتی قوانین بالکل آزادی کے ساتھ شریعت کے متوازی موجود رہ سکتے ہیں۔

اسلام میں بھرپور کثیر نسلی اور کثیر تمدنی آزادی ہے۔ بلاشبہ اسلام کا اپنا تعزیریاتی نظام ہے، لیکن یہ تعزیریاتی نظام ملزم کے دفاع سے بھرپور ہے، اس حد تک کہ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنا دفاع کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر اسلامی تعزیریاتی قوانین بمشکل ہی عملی اطلاق پاتے ہیں۔ اس کی

ایک نمایاں مثال زنا بالجبر کی صورت میں چار گواہیوں کی ضرورت ہے جو کہ مجرم قرار دیئے جانے کے لئے طلب کئے جاسکتے ہیں۔ اس قسم کی قانونی ضرورتیں مجرم دیکھے جانے کو تقریباً ناممکن بنا دیتی ہیں۔

اسلامی قانون میں ملزم کے دفاع کے حوالے سے مکمل تفصیلات میری کتاب ”اسلام اور سزا“ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسلام میں مطلق العنان پولیس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کسی بھی مطلق العنانیت کے خلاف سب سے عظیم دفاع حقوق ملکیت کا تحفظ ہے۔ اسلام میں حقوق ملکیت کی ضمانت شریعت کے ذریعے فراہم کی گئی ہے۔ اسلام میں کمیونسٹ ریاستوں ایسی حماقتوں کی کوئی گنجائش نہیں جو کہ پورے معاشرے کو نئے ڈھب پر ڈھالنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ ان کے احمقانہ منصوبوں کو ہر رخ سے کامیابی مل سکے۔

اور وہ ایسا کر سکتے ہیں کیوں کہ وہاں کوئی قانون ملکیت نہیں ہوتا جو انہیں ایسا کرنے سے روکے۔ قدیم اسلام کی معیشت آزاد معیشت ہے جس میں ریاست کا کردار محدود ہے اور انفرادی ملکیت کے قابل افراد اپنی زندگیوں کا رخ متعین کرنے میں آزاد ہیں۔ شریعت میں یہ اختیار ریاست کے پاس نہیں کہ وہ بے اختیار معیشت کو کنٹرول کرے یا اس کا رخ متعین کرے۔ سود وغیرہ سے متعلق بہت سارے ضابطوں کی تعمیل و اقتضا باہمی اعتماد پر ہوتی ہے جس کی نگرانی شرعی عدالت کرتی ہے نہ کہ اسے ریاستی نوکر شاہی کے ذریعے باضابطہ بنایا جاتا ہے۔

بلاشبہ شریعت میں قانونی بھول بھلیوں کا ایک نظام ہے جسے حیلے کہا جاتا ہے۔ یہ حیلے شریعت کو اس قابل بنادیتے ہیں کہ وہ ایسا تاثر قائم کرے کہ گویا شریعت کے اندر رہتے ہوئے ان پیچیدگیوں کو سمجھا دیا گیا ہے۔ لہذا نفع پر ادھار دینے کو شریعت کے اندر ہی نمٹا لیا جاتا ہے اگر کچھ رسمی تقاضے پورے کر لئے



جائیں۔ علم معیشت ایک آزاد معیشت ہے۔

قدیم اسلام کسی بھی حوالے سے مطلق العنان نہیں ہے اور یہ بات ثابت کرنے کے اور بھی کئی نکات اٹھائے جاسکتے ہیں۔ لیکن کچھ مسلمان واقعی ایسے ہیں جن کا جھکاؤ مطلق العنانیت کی طرف ہے۔ تاہم وہ لوگ قدیم نہیں ہیں بلکہ گمراہ لوگ ہیں۔ گمراہ لوگ خود کو مطلق العنان نہیں سمجھتے البتہ ان کے اندر ایسے احکامات موجود ہوتے ہیں جو انہیں مطلق العنانیت کی طرف لے جاسکتے ہیں۔

مطلق العنانیت کی نجی ریاست کی پرستش اور حکمران کی معاشرے پر فوقیت ہے۔ شیعیت اپنے اس اصرار کے ساتھ کہ حکمران اللہ کا چنیدہ ہوتا ہے اور اس کا تعلق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان سے ہوتا ہے لوگوں کو ریاست کی پرستش کی طرف گامزن کر سکتا ہے۔ شیعہ امام عام مسلمانوں سے بلند تر جاتا ہے اور اس کی حاکمیت کو خود اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ حکمران کے منہ سے نکلا ہوا لفظ و اعتنا قانون کا درجہ رکھتا ہے، وہ شریعت سے بالا ہوتا ہے اور اسے جب چاہے تبدیل بھی کر سکتا ہے علماء اور معاشرے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اور امام ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہابیت شریعت کو کھوکھلا کرتی ہے۔ وہ قدیم اسلامی قوانین سے دور بھاگتے ہیں اور شریعت میں موجود لچک دارانہ رویہ کو بیچ گنی کرتے ہیں۔ اس لچک کے برعکس وہ انتہائی سخت گیر ہوتے ہیں جو کہ شریعت کا نفاذ بالجبر بذریعہ مذہبی پولیس کرتے ہیں۔ وہ پولیس اس مشفق بزرگ یعنی محتسب جیسی نہیں ہوتی۔ وہ شدید تفرقہ پسند ہیں یہاں تک کہ ایسے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور قتل تک کر گزرتے جو ان کی پیروی نہیں کرتے وہ انہیں مشرک کہہ دیتے ہیں۔

پچھلے ساٹھ سالوں میں گمراہ لوگ جدید بنیاد پرستوں کی شکل اختیار کر گئے

ہیں اور انتہائی سخت قسم کے مطلق العنان بن گئے ہیں۔ انہوں نے فرد اور معاشرے کو مکمل طور پر ایک ایسی چیز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے جسے اسلامی ریاست کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کا مقصد پولیس کی دہشت قائم کرنا ہوتا ہے جو کہ کچھ ایسی ہی چیز بن جاتی ہے جیسی ہٹلر کے پاس تھی۔ وہ اس حق کا دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت کو مکمل طور پر از سر نو اس طرح لکھا جاتا چاہئے جیسا انہیں پسند ہو۔

اس طرح درحقیقت وہ قدیم اسلامی قانون سے جان چھڑاتے ہیں اور اس کی جگہ ریاست کھڑی کرتے ہیں۔ سیاسی جماعت کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ بنیاد پرستوں کی یہ مطلق العنانیت بلاشبہ کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے، ان سب نے براہ راست کمیونسٹوں اور فرسٹائیوں کی تقلید کی ہے اور خاص طور پر ہٹلر کی جس کی حسن البنا اور مودودی بہت تعریف کرتا ہے۔

بنیاد پرستوں نے حد درجہ کی ناشائستگی کا ارتکاب کیا ہے، انہوں نے ہٹلر ازم میں یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ اللہ قادر مطلق کی رحمت ہے۔ انہوں نے اتنی جرأت یہ سوچ کر کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہٹلر اور اسٹالن کی طرح قبضہ کرنے اور ظلم کرنے کا اختیار دے گا۔ بلاشبہ یہ کہنا ایک انتہائی غلیظ گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے خوفناک فعل میں برکت دے۔

بلاشبہ یہ ان گمراہ لوگوں کے سبب سے ہے کہ اسلام بطور ایک مطلق العنان مذہب مشہور ہو گیا ہے اور یہ شہرت اسلام کے لئے کتنی نقصان دہ ہے۔ اسلام کا سارا حسن، اس کا زرخیز ماضی اور تمدن بھلا دیا گیا ہے اور سب لوگوں کے سامنے یہی ہولناک لوگ ہیں۔ اس وجہ سے مجھ سے یہ سوال کیا گیا جو مجھے اس باب کی طرف لے گیا۔ ان گمراہ لوگوں کو اتنے بڑے نقصان کا احساس کرنا چاہئے جو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کا کیا۔



پوچھنے کے لئے ایک عام سا سوال یہ ہے کہ اسلام کیوں مطلق العنان نہیں؟ ایک حکمران کے لئے یہ امر کیوں ناممکن ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو مجبور کرے کہ وہ نیک بن جائیں۔ ہم جس عجلت سے یہ سوال کرتے ہیں اس کا جواب بھی اتنا ہی واضح ہے کیوں کہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔

اسلام کی تاریخ ایسے لوگوں سے بھری ہوتی ہے جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ نیک ہیں اور ہر فرد کو نیک بنانے کی مہم پر نکلے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ ہمیشہ ناکام ہوا اور وہ بدعنوان بن کر سامنے آئے۔ جب بھی انسانوں پر حکومت کی گئی وہ ہمیشہ ناکام ہوئی۔

ابتدا سے ہی اسلام کی تعمیر اس عقیدے پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت واجب ہے اور انسان کی حاکمیت بذات خود برائی ہے۔ اسلام ابتدا سے ہی حکمرانوں اور ریاست کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کا مقابلہ کرتا آیا ہے۔ اس کے بجائے اسلام امت کو پہلی ترجیح دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حکمران کی تعظیم بت کی طرح نہیں کی جاتی اور امت کو اولیت دی جاتی ہے۔

مسلمانوں کے حقیقی راہنما کبھی بھی حکمران اور سیاستدان نہیں تھے بلکہ دانا اور پاکیزہ شخصیتیں علماء اور اولیاء تھے۔ شروع دن سے ہی اسلام نے ہمیشہ معاملات کو اس طرح چلایا ہے کہ وہ مطلق العنانیت کی طرف کوئی تحریک بننے سے محنت رہیں۔

بنو امیہ، بنو عباس اور بعد کے حکمرانوں کی پوری تاریخ اسی نقطہ نظر سے سمجھی جاسکتی ہے کہ مسلمان ریاست کی پوجا کی کسی بھی تحریک کو مسترد کرتے ہیں اور ریاست کی پوجا ہی بیسویں صدی میں ہٹلر اور اسٹالن کی ہولناکی کا پیش خیمہ بنی۔ قدیم اسلام اس امر میں یقین رکھتا ہے کہ مسلمانوں کو اتنی کم حکومت کی ضرورت

ہے جتنی کہ ممکن ہو زیادہ سے زیادہ آزادی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ تک محبت کے ذریعے رسائی حاصل کریں۔ اسلام اس امر پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے محبت کرتا ہے اور اسے پسند نہیں کہ زندگی کو ان کے لئے تکلیف دہ بنائے۔

قدیم اسلام اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ کسی بھی حکمران پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ حکمرانوں کو ہمیشہ علماء اور اولیاء کی نگرانی کی ضرورت ہے جو کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کرتے ہیں۔ اسلام ہر اس تحریک کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے جس کے قدم ریاست کی پوجا یا مطلق العنانیت کی طرف اٹھتے ہیں۔ قدیم اسلام کی جو خوبیاں ہم نے بیان کی ہیں ان کی وجہ قانون کے مختلف مکاتب فکر، قبائلی اور نسلی رنگارنگی کی اجازت اور حق رازداری وغیرہ ہیں۔

قدیم اسلام انتہائی مطلق العنانیت کا مخالف ہے اور یہ اس کا ثبوت ہے کہ وہ بالکل سچا ہے اور دوسرے فرقے جھوٹے ہیں۔ اسلام مطلق العنانیت کو مسترد کرنے میں بالکل ٹھیک ہے، مطلق العنانیت کبھی بھی فعال نہیں رہی، یہ اس معاشرے کو تباہ کرتی ہے جس پر اس کی حکمرانی ہو جس طرح ہٹلر نے جرمنی اور اسٹالن نے بالآخر روس کو تباہ کیا۔

بنیاد پرستوں پر خود ہی منکشف ہو جائے گا کہ مطلق العنانیت قابل عمل نہیں رہے گی۔ یہ انہیں اسی طرح تباہ کر دے گی جس طرح اس نے ہٹلر اور اسٹالن کو تباہ کیا تھا کیوں کہ ان کی وجہ سے اسلام نفرت کے باعث ختم ہو جائے گا نہ کہ محبت کے سبب، جہاں بھی وہ غالب آئیں گے لوگ اسلام سے بھاگ جائیں گے اور منافقت اختیار کر لیں گے تاکہ بنیاد پرست پولیس برہم نہ ہو۔

آخر کار دوسرے تمام فرقوں کو اپنے خیالات سے دستبردار ہونا اور قدیم اسلام کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ میں ان حضرات کو جنہوں نے اس باب کا مطالعہ کیا



دعوت دیتا ہوں کہ وہ قدیم اسلام کی طرف آئیں، ریاست کی پوجا اور مطلق العنانیت ترک کر دیں۔

مسلمانوں کو قدیم اسلام کی طرف دعوت دینا ایسا کام ہے جو آج کے مسلمانوں پر واجب ہے۔ اس کام کا مقام آغاز رسول اللہ ﷺ سے بہت زیادہ اور بھرپور محبت اور تعظیم ہے۔ ہم یہ چیز امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سیکھ سکتے ہیں۔

## اسلامی ریاست کا حقیقی تصور

مسلم سیاست میں کلیدی سوال اسلامی ریاست کا نظریہ ہے۔ اس باب کا مقصد اسی چیز کی وضاحت ہے لیکن قدیم اسلام کے نقطہ نظر سے باب اس امر کی بھی وضاحت کرے گا کہ یہ نظریہ دیگر فرقوں کے پیش کردہ نظریہ اسلامی ریاست سے کس طرح مختلف ہے، یہ قدیم اسلامی ریاست کس طرح قائم کی جاسکتی ہے اور اس کے قائم کرنے سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

قدیم ریاست کا اسلامی تصور واپس اسلام کے ابتدائی دنوں کی طرف لے جاتا ہے جو کہ خلافت کے زوال کے بعد چاروں خلفاء راشدین کے وصال کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ اسلام میں یہ ریاست کا مرکزی تصور تھا اور مغرب کی آمد تک اسی نظریہ نے مسلمان حکومتوں کی راہنمائی کی۔ مسلم ریاستوں کے انہدام کا سلسلہ اٹھارویں صدی کے اختتام سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس سے امام غزالی، ابن خلدون اور ابن رشد ایسے عظیم اسلامی مفکر مانوس ہیں۔

اسلامی ریاست کے قدیم تصور کا مرکزی خیال یہ ہے کہ کوئی بھی شخص حکمراں ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس پر ٹھیک اسلامی طریقے سے کنٹرول و پابندیاں عائد ہوں۔ اسلامی ریاست کے قدیم تصور میں حکمراں جو کہ ریاست کا سربراہ ہوتا ہے کوئی بھی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو فی الحقیقت اس کا اہل ہو کہ اختیارات اپنے پاس رکھ سکے۔ حکمراں ایک بادشاہ بھی ہو سکتا ہے اور قبائلی راہنما بھی، وہ ایک کامیاب سپاہی بھی ہو سکتا ہے، وہ ایک جدید سیاستداں بھی، اس کے اختیارات کسی سیاسی جماعت کی قیادت سے اخذ شدہ بھی ہو سکتے ہیں یا الیکشن میں فتح مند ہونے کے باعث بھی۔

سیاسی قوت کے وجود کو قدیم مسلم تصور ریاست میں بالکل ایسے ہی تسلیم کیا



گیا ہے جیسے کہ پوری دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اہمیت کا حامل یہ امر ہے کہ موجودہ سیاسی قوت پہلے تسلیم کی جانی ہے پھر اس پر اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق پابندیاں اور کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس تصور کا پہلا اصول ہے کہ مسلمانوں کے اصل راہنما علماء اور اولیاء ہیں۔ ملک کے اندر علماء اور اولیاء پر مشتمل ایک ڈھانچہ ضرور ہونا چاہئے، ان کے پاس نہایت اعلیٰ تعلیمی قابلیت اور آبادی کے اندر ان کا وقار نہایت عمدہ ہونا چاہئے، انہیں اتنی اہلیت کا حامل ہونا چاہئے کہ وہ ریاست کے حکمرانوں کو راہنمائی کر سکیں، ان کا حکمرانوں پر نہایت گہرا اثر و رسوخ ہونا چاہئے۔

انہیں ملک کے تمام اہم اداروں میں مرکزی شخصیت حاصل ہونا چاہئے، سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں ملک کے عدالتی اداروں پر تصرف حاصل ہونا چاہئے، انہیں پورے معاشرے کے اندر پھیل جانا چاہئے اور تعلیمی و سماجی خدمات کے علاوہ دوسرے معاشرتی ادارے چلانے چاہئیں۔ اگر ضروری ہو تو انہیں اس قابل ہونا چاہئے کہ حکمران کی جاری کردہ غلط پالیسیوں کو روک دیں اور آخر کار انہیں یہ بھی اختیار ہونا چاہئے کہ برے حکمران کو برطرف کر سکیں۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ریاست میں فرد کی حکمرانی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی ہونی چاہئے۔ اس کا مطلب ہے شریعت کی حکمرانی۔ قانون خداوندی کی حکمرانی، علماء حکمرانوں کی راہنمائی کے سلسلے میں صرف عقل کا استعمال ہی نہیں کرتے بلکہ شریعت کو پیش نظر رکھ کر راہنمائی کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی تسلی کرتے ہیں کہ ریاست ہر وہ کام شریعت کے مطابق کرنے کی پابند ہے جو وہ کر سکتی ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ شریعت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے کوئی بھی شخص تبدیل کر سکے یا وقت کے ساتھ ساتھ اسے بناتا سنوارتا جائے۔ شریعت کو ایسا ہی ہونا

چاہئے اور صرف ایسی ہی شریعت ہو سکتی ہے جیسی کہ قدیم اسلامی شریعت ہے جسے کوئی بھی شخص کسی بھی حوالے سے تبدیل نہیں کر سکتا کیوں کہ اجتہاد کے دروازے بند ہیں۔ یہ شریعت آزاد ہے، مقامی سطح تک منقسم، رحمت اور چلک سے بھرپور نہ کہ کسی ریاست کا جابرانہ قانون۔

شریعت کو زندگی میں علماء لے کر آتے ہیں اور مسلم امت ریاست سے آزاد اور خود مختار ہے۔ قدیم اسلام میں حکمران پورے معاشرے کو اس طرح نہیں چلاتے جس طرح کہ کمیونسٹ آمر ایک مرکز سے پورا ملک چلاتے ہیں۔ حکمران پر صرف ایسے مسائل کے حل کے لئے بھروسہ کیا جاتا ہے جہاں طاقت کے استعمال کی ضرورت ہو یا کسی فساد کو ختم کرنا ہو مثلاً بیرونی دنیا سے دفاع یا اندرونی نگرانی۔ حکمران فوج اور پولیس کو کنٹرول کرتا ہے اور شریعت کے مطابق امت اور مسلمانوں کا دفاع کرتا ہے۔

مسلم معاشرہ دیگر تمام معاملات خود ہی چلاتا ہے۔ مسلمان اور ان کے عمائدین، علماء اور اولیاء خود ہی تعلیم، سماجی خدمات، بہبود، غریبوں کی امداد اور صحت وغیرہ کے شعبے منظم کرتے ہیں۔ شرعی عدالت مقامی علماء چلاتے ہیں اور مسلمان کوئی سماجی تنظیم قائم کرنا چاہیں تو علماء اسے سند جواز فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح قصبہ اور دیہات اپنی قیادت کے ذریعے خود بخود چلتے ہیں اور جب کبھی ضرورت پڑے تو شرعی عدالت کے ذریعے اپنے تنازعات کا اندراج کراتے ہیں اور قانونی چارہ جو کی کرتے ہیں۔

قدیم اسلامی ریاست میں غیر مسلم اپنے معاملات بغیر ریاستی مداخلت کے خود نمٹاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سلطنت عثمانیہ میں ملت سسٹم کے تحت سیکڑوں برس تک ایسا ہوتا رہا۔ معاشرہ مسلم ریاست میں پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ خود بخود چلتا ہے۔



پانچواں اصول یہ ہے کہ یہ تصور معاشرے میں صرف اسی وقت فعال ہو سکتا ہے جب معاشرے کی غالب آبادی مسلمان ہو اور جہاں اسلام اور مسلمانوں کے خیالات معاشرے پر غالب ہوں۔ علماء اور اولیاء صرف اس صورت میں حکمرانوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اگر ایسی آبادی موجود ہو جو ان کی تائید کرے۔ شریعت صرف اسی صورت میں غالب ہو سکتی ہے اگر آبادی کی اکثریت اس کی اطاعت پسند کرے۔

ششم مسلمان ریاست کا قیام ایسے ممالک میں ناممکن ہے جہاں مسلمان ایک چھوٹی اقلیت ہیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کے لئے حکمت عملی یہ ہے کہ وہ معاشرے کے اندر اپنے جزیرے قائم کریں اور ملک کے افسران مجاز کے ساتھ اتنی اچھی سودا بازی کریں جتنی ممکن ہو۔ سب سے بڑھ کر اس کا مقصد مسلمان ہونے کے ناطے آزادی ہے۔

قدیم اسلامی ریاست کا پانچواں اصول ایک ایسی ریاست کی تشکیل کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو مسلمانوں کی عزت کرے گی، نہایت ذمہ داری سے کام کرے گی، نہایت رواداری اور قانون کی پابندی کرتے ہوئے حکومت کرے گی۔ اس کا خلاصہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ شرعی اقلیتی نظام والی ریاست اسلامی ریاست کا تصور دوسرے مسلم فرقوں کے تصور سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ اہل تشیع کے ہاں حکمران کے حوالے سے امام کا تصور پایا جاتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا منتخب کردہ ہوتا ہے۔

ایسی ریاست میں علماء اور مسلم معاشرہ مکمل طور پر مغلوب ہوں گے۔ بد قسمتی سے جب بھی یہ شیعہ امام برسر اقتدار آتے ہیں تو اس طرح بے دخل ہوتے ہیں کہ کوئی ایک بھی انہیں قبول نہیں کرتا جبکہ دوسرے مختلف شیعہ حضرات ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ ان کے حق میں دستبردار ہو جائے۔ شیعہ تصور ریاست

ویسے بھی بڑا آمرانہ اور استبدادانہ ہے۔ ایران کا نیا تصور جو کہ ۱۹۷۹ء سے قائم ہے درحقیقت حکمران کو ہر طرف کر کے علماء کو اقتدار میں لاتا ہے۔

علماء حکمران کو کسی کام سے روک نہیں سکتے کیوں کہ وہ خود حکمران ہیں۔ یہ علماء شریعت کو سر بلند نہیں رکھ سکتے کیوں کہ اعلیٰ قسم کے علماء شریعت کو اپنے اجتہاد کے ذریعے بدل سکتے ہیں۔ اس تصور کا حاصل بھی بڑا آمرانہ اور استبدادانہ ہے۔ اسلامی جدت پسندوں نے بڑے آرام سے ایسی ریاست کو قبول کر لیا ہے جہاں اسلام کی کوئی حکمرانی نہیں ہوتی اور اسلام صرف ذاتی عبادت بن کر رہ جاتا ہے، نتیجہ ایک ناقابل یقینی ظلم ہے کیوں کہ وہاں نہ علماء ہیں نہ اولیاء جو ریاست کا راستہ روکیں لہذا وہاں قانون سے بالاتر پولیس کی حکمرانی ہوتی ہے۔ حکومت ہر پانچ منٹ کے بعد قانون بدلتی ہے اور اس کا حاصل حکمران کے دوستوں کے لئے بہت بڑا منافع ہے۔

اسلامی ریاست کا تصور جو مودودی ایسے لوگوں نے پیش کیا وہ بھی قدیم تصور سے بہت زیادہ مختلف ہے، مودودی کا تصور درحقیقت کمیونزم کی مطلق العنان اور فاشٹ ریاست سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے۔ بلاشبہ اس کو وہاں سے نقل کیا گیا ہے، ایسے تصورات کو رو بہ عمل لانے کا نتیجہ لاشوں کے پہاڑ کھڑے کرنا ہوگا بالکل ایسے ہی جیسے ہٹلر اور اسٹالن کا خاتمہ لاشوں کے ڈھیر پر ہوا۔ مودودی کا نظریہ اسلامی ریاست ایک خواب اور بالکل تصوراتی چیز ہے جو کہ اس کے اپنے دماغ کی ایجاد ہے۔ قدیم تصور فی الحقیقت مسلمانوں کے گزشتہ چودہ سو سال کے تجربات کا حاصل ہے۔

قدیم اسلام کا یہ تصور امام غزالی ایسے عظیم مفکرین نے اپنے زندگی بھر کے تجربات اور تاریخ کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا۔ انہوں نے یہ تصور خالصتاً اس لئے ترتیب دیا کہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے تصورات غیر حقیقی اور ناممکن



العمل ثابت ہوئے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی سے حاصل شدہ تجربات سے یہ محسوس کر لیا کہ شیعہ امام کی حکومت درحقیقت کیسی ہے۔ ابن خلدون ایسے عظیم مسلمان نے دیکھ لیا کہ سیاسی طاقت کی جڑ دراصل قبیلہ پسندی جیسی چیز میں ہے جسے اس نے عصبیت کا نام دیا۔ لہذا اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ خالصتاً اسلامی حکومت قائم کرنا ناممکن ہے لیکن آپ کو ایسے سیاسی راہنماؤں کو تسلیم کرنا ہوگا جو قیاسیت جیسی چیزیں پیدا کرتے ہیں اور ان کو علماء کے ماتحت دیتے ہوئے ان کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ اب ہمیں یہ بات صاف صاف تسلیم ہوگی کہ اسلامی انقلاب کے ذریعے حصول اقتدار کی کوششیں کوئی ایسی چیز پیدا کرنے والی نہیں ہیں جن کی خاطر جنگ لڑی جائے۔ مودودی کے تمام خیالات نا کام ہو چکے ہیں۔

بلاشبہ ریاست کے نظریات اصل حکومت کو جنم دے چکے ہیں۔ جب یہ حکومت اقتدار میں ہو تو قدیم اسلام کا رویہ ان حکومتوں کے ساتھ ایسا ہونا چاہئے جیسا کہ غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی کوشش ہونی چاہئے کہ اس ریاست پر قدیم علماء کا اثر و نفوذ بڑھے یہاں تک کہ وہ ریاست ایک ٹھیک اسلامی ریاست میں بدل جائے۔ قدیم طریقہ کار کسی بھی ریاست پر اپنایا جاسکتا ہے خاص طور پر ایسی ریاست کے لئے جس کے اسلامی ہونے کے تصورات گہرے ہیں۔ قدیم تصور ریاست کی بنیاد اب بھی مکمل حقیقت پسندی ہے جیسا کہ ہزار سال پہلے تھی، ایسی ریاست کے قیام کا طریقہ کار پر علاقے اور ہر ملک میں جدا ہے۔ ریاست کے قیام کے لئے منصوبہ بندی، مقامی حالات مطالعہ کی بنیاد پر ہی کی جاسکتی ہے۔ کچھ مقامات پر یہ کام آسان ہو سکتا ہے، کچھ مقامات پر ہو سکتا ہے کہ صرف قانون کے چاروں اسکولوں کو لاگو کرنا ضروری ہو، کچھ دوسرے مقامات پر علماء کے معیار کو بہتر بنانا ضروری ہوتا کہ عوام میں اپنا وقار بڑھاپائیں

اور ریاستی معاملات نمٹانے کے لائق ہو جائیں۔

کئی دوسرے مقامات پر قانون کی حکمرانی کی بنیاد رکھنے اور بھونڈے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لئے لڑائی لڑی جاسکتی ہے۔ ایک نمایاں تبصرہ یہ ہے کہ اس کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ قدیم اسلامی ریاست کے قیام کے لئے سوائے چند صورتوں کے موجود حکومتوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کے برعکس لب لباب یہ ہے کہ موجودہ حکومتوں کو تسلیم کر لیا جائے لیکن انہیں علماء اور شریعت کے ذریعے اسلامی بنایا جائے۔

اسلامی ریاست کی طرف جانے والی شاہراہ پر ہر جگہ ریاست کے اختیارات میں کمی ہے۔ ریاست کو ہر صورت قانون کی حاکمیت تسلیم کرنا ہوگی اور اس کا مطلب ہے شریعت کی حاکمیت۔ ریاست کو بہر حال ایسے علماء کو تسلیم کرنا ہوگا جو ظلم پر روک لگائیں۔ ریاست کو بہر صورت معاشرے کو اپنے معاملات خود چلانے کی اجازت دینی ہوگی۔

اسلامی ریاست کا راستہ کم تر ریاست کا راستہ ہے۔

امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسلامی ریاست کے قیام کے لئے ۱۹۱۲ء کے چار نکاتی پروگرام میں مسلمانوں کے لئے لائحہ عمل مرتب کیا ہے جس کی مسلمان پیروی کر سکتے ہیں۔ وہاں انہوں نے مسلم طبقے کے لئے معاشرے میں ابھرتے ہوئے ایک جزیرے کا تصور پیش کیا ہے جس کی اپنی معیشت ہوگی، جو آزادانہ طور پر خود بخود علماء اور اولیاء کے ذریعے چلے گی اور اپنے اسلامی تمدن کی نشوونما کرے گی۔ اگر اس منصوبے پر عمل کیا گیا تو علماء معاشرہ میں بہت زیادہ طاقتور بن جائیں گے اور اس سماجی طاقت کے ذریعے آہستہ آہستہ اس قابل بن جائیں گے۔ موجودہ ریاست پر چھا جائیں اور اسے اسلامی ریاست میں بدل دیں۔



علماء کو ایک چیز کی اشد ضرورت ہے اور وہ ہے ایسے افراد کے ساتھ مضبوط رابطہ جن کے پاس سیاسی اختیار ہوتا کہ وہ آہستہ آہستہ اسلامی تعلیمات سے ان کے دل جیت لیں۔ اسلام کے عہد وسطیٰ میں علماء حکمران کے لئے ایک تحریر مرتب کرتے تھے جسے شہنشاہ کے لئے آئینہ کہا جاتا تھا۔ اس کتاب میں حکمران کے لئے اپنے زمانے کے مطابق راہنمائی ہوتی تھی۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ قادریہ، نقشبندیہ اور دوسرے صوفی سلسلوں کا ایک خاص رویہ حکمرانوں کو متاثر کرنے کے حوالے سے بھی تھا۔ بلاشبہ علماء کو اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ گمراہ لوگوں کے نظریات کا مقابلہ کریں۔ یہ نظریات غلط ہیں اور وقت بھی انہیں غلط ثابت کرے گا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی ریاست اب قائم ہو سکتی ہے۔ خوش بختی سے مسلم دنیا میں موجود تمام حکومتیں قابل قبول ہیں۔ مسلمانوں کے لئے اصل ضرورت برداشت کی ہے۔ بلاشبہ ہمیں ضرورت ایسے علماء کی ہے جن کا معیار بہت بلند ہو۔

اسلامی ریاست کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔

اولاً تو ایسی ریاست ان لوگوں کو آزادی فراہم کرے گی جو اس کے اندر رہتے ہوں گے۔ آزادی قانون کی موجودگی کا نام ہے جس سے رعایا بالکل محفوظ ہو جاتے ہیں بشرطیکہ وہ قانون شکنی نہ کریں۔ قدیم اسلامی ریاست کی کل بنیاد قانون کی حکمرانی ہے، اللہ تعالیٰ کا قانون، قدیم اسلامی شریعت۔

ثانیاً یہ ریاست مسلم معاشرے کو آزادی فراہم کرے گی، ہر مسلمان ایک بادشاہ ہے اور مسلمانوں کو اس قابل بطور ایک آزاد وجود از سر نو تشکیل کرے گی۔ جدید سیاسی نظریے کی زبان استعمال کریں تو عوامی معاشرہ از سر نو جنم لے گا۔

ثالثاً یہ اسلامی ریاست ان خوفناک مسائل کو حل کر دے گی، جدید ریاست

مسلمانوں میں لے آئی ہے، خاص طور پر بھیانک نسل پرستی، فرقہ پرستی اور ذات پات جو کہ پوری مسلم دنیا کی خوش بختی پر لعنت ہیں۔

رابعاً یہ اسلامی ریاست ایک ایسی ریاست جنم دے گی جو مضبوط ہوگی، مسلم دنیا میں موجود حکومتیں کمزور ہیں اور وہ خاص کر اس لئے کمزور ہیں کہ ظلم پرور ہیں۔ اسلامی حکومت مضبوط ہوگی کیوں کہ یہ ایک اچھی حکومت ہوگی ہر اس حق کے ساتھ جس کی تائید کی جانی چاہئے۔

آخری بات یہ کہ اس ریاست کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک حقیقت پسند ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ فی الحقیقت موجود ریاستوں سے آغاز کیا جائے۔ انہیں تسلیم کیا جائے، آہستہ روی سے انہیں کم ظالم اور زیادہ اسلامی بنایا جائے۔ یوں کسی ختم نہ ہونے والی جدوجہد کی ضرورت ہے اور نہ ہی لاشوں کے پہاڑ بننے کا خطرہ۔

مسلم تاریخ پر نظر ڈالئے، مسلمانوں نے زندگی کا پیش تر حصہ ایسی حکومتوں کے زیر اثر گزارا ہے جن کی راہنمائی مسلمانوں کے قدیم تصور ریاست کے حوالے سے کی گئی تھی۔ مسلمانوں کے لئے اب وقت ہے کہ مغربی ریاست کی ناکامی کے بعد وہ اس طرف کے نظام حکومت کی طرف لوٹیں۔

اسلامی ریاست کا سچا تصور ہم پر عیاں کرتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے زندہ رہنے کا واحد طریقہ یہی ہے۔



## بوسنیا کا سبق

بوسنیا مسلمانوں کی مکمل تباہی کا منہ بولتا ثبوت ہے کیوں کہ سینکڑوں ہزاروں افراد قتل ہوئے، لاکھوں پناہ گزین بنے، دنیا بھر کی مسلمان حکومتیں اس بربریت کو روکنے کے لئے کچھ نہ کر سکیں جب کہ دوسری حکومتیں کھڑی تماشا دیکھتی رہیں اور کچھ نہ کیا۔ یہاں ہمارا مقصد اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ ایسا کیوں ہو اور مسلمانوں کے لئے مستقبل کے حوالے سے سبق اخذ کرنا ہے۔

بہت سارے مسلمانوں نے بوسنیا میں پیش آنے والے واقعات کی توضیح یہ کہہ کر کی ہے کہ وہاں مسلمانوں کے خلاف بدترین سازش کی گئی ہے اور بوسنیا کی تباہی کے لئے خفیہ منصوبہ بنایا گیا ہے۔ انہوں نے اسے مغرب میں اسلام کے خلاف پائی جانے والی عمومی نفرت کے طور پر لیا ہے۔ مغربی حکومتوں کی خواہش ہے کہ مسلمانوں کو قتل کیا جائے اور اسلام کو تباہ کیا جائے۔ یہ نظریہ ہو سکتا ہے صحیح ہو۔ اصل حقیقت اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے کہ لاکھوں مسلمان قتل یا زخمی ہو چکے ہیں، عورتوں کے ساتھ زنا کیا گیا ہے اور انہیں پناہ گزین بنادیا گیا ہے لیکن بڑی طاقتوں کو یہ بات ناگوار تک نہیں گزری۔

بڑی طاقتوں نے بوسنیا کو قتل ہونے دیا، نفرت کی وجہ سے نہیں کیوں کہ وہ غفلت نہیں کر سکتے تھے، جو کچھ ہو رہا تھا اس سے آگاہ تھے لیکن وہاں کوئی اتنی مضبوط وجہ نہیں تھی جو انہیں مداخلت کرنے کی مصیبت میں جھونک دیتی۔

بڑی طاقتوں نے قوت کا استعمال کیا اور آخری کوشش کے طور جنگ میں کود مے کیوں کہ ان کے پاس ایسا کرنے کی وجہ تھی۔ بوسنیا میں کچھ کرنے کی کوئی

وجہ نہیں سوائے اس کے کہ لوگوں کو خوفناک مصائب کا شکار دیکھ کر دلوں میں ہمدردی پیدا ہوتی۔ بین الاقوامی معاملات میں کچھ کرنے کے لئے ہمدردی کوئی وجہ نہیں۔ بوسنیا میں پیش آنے والے واقعات بڑی طاقتوں کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی خطرہ نہیں تھے۔ عرب، برطانیہ، فرانس یا امریکہ پر حملہ کرنے والے نہیں تھے۔ اگر سربوں کے پاس ایٹم بم اور میزائل ہوتے جو وہ برطانیہ یا امریکہ پر برسرِ اسکتے تب نیٹو بغیر کسی وجہ کے اپنی بھرپور قوت کا استعمال کرتے ہوئے سربوں کو فنا کرتی خواہ اس کے لئے اسے کوئی بھی قیمت چکانی پڑتی۔

سرد جنگ کے زمانے میں اس بات کا خطرہ ہوا کرتا تھا کہ بوسنیا ایسے واقعات کمیونسٹوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں کیوں کہ سوویت یونین اس قسم کے انتشار کی صورت حال فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اقتدار میں توسیع کر چکا تھا۔ بڑی طاقتیں اس بات سے بھی خوفزدہ ہوا کرتی تھیں کہ یہ جنگ کہیں روس اور امریکہ کے درمیان جنگ نہ بن جائے۔ ایسی صورت حال میں اس امر پر اتفاق رائے پیدا کرنے کے لئے اعلیٰ سطح کے اجلاس منعقد ہوئے کہ بوسنیا میں کیا ہونا چاہئے اور سربوں کو بتادیا جاتا کہ وہ کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔ اگر سرب کمیونزم کے دوست دکھائی دیتے تو مغرب بوسنیا کو کیل کانٹے سے لیس کرتا کہ وہ کمیونسٹوں کی جارحیت کو روکے۔ بالکل اس طرح افغانستان میں سویت اثر و نفوذ کو واپس ڈھکیلنے کے لئے اسلحہ کے ڈھیر لگا دیئے گئے تھے۔ بوسنیائی لوگوں کو درپیش خوفناک مصیبتیں کمیونسٹ بربریت کے طور پر دیکھی جاتیں اور اس قتل عام اور زنا بالجبر کو روکنے کے لئے سب کچھ کیا جاتا۔

بلاشبہ سرد جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہے لہذا بڑی طاقتوں نے ان میں سے کوئی



بھی کام نہیں کیا باوجود اس حقیقت کے کہ سرب قیادت پرانی طرز کے عمدہ کمیونسٹ غنڈے ہیں۔ اس قسم کے غنڈے بلاشبہ نہ ہی خود کو زیادہ دیر تک کمیونسٹ کہتے اور نہ ہی زیادہ دیر تک سویت یونین کے لئے کام کرتے جیسے کہ اپنا وجود برقرار رکھنے سے روک دیا گیا ہے۔

مغرب بوسنیا میں مداخلت کر سکتا تھا اگر انہیں اس بات کا خیال گزرتا کہ یہ جنگ مغربی یورپ میں پھیل سکتی ہے۔ انہیں اس بات کا گمان بھی نہیں گزرا کہ ایسا ہوگا۔ سب سے بڑی چیز جس کی وہ پیش بینی کر سکتے تھے، وہ جنگ بلقان تھی۔ لیکن ایک مستحکم بلقان معمولی دلچسپی کا حلقہ ہے۔ ایک مستحکم بلقان کی تشکیل کے لئے بہترین لائحہ عمل سربوں کو اس امر کی اجازت دینا ہے کہ وہ جیت جائیں گے اور جب وہ جیت جائیں گے تو یہی چیز بلقان کو مستحکم بنا دے گی لہذا کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس موقع پر مداخلت کی جاتی۔ بالکل انہی وجوہات کے پیش نظر مغرب نے چوچینیائی باشندوں کے قتل پر ایک لفظ تک نہیں کہا کیوں کہ وہ ایک مضبوط روس کو ہی دنیا کے اس حصے میں استحکام کی شاہراہ تصور کرتے ہیں۔

مغرب جب بھی جنگ کا راستہ اختیار کرتا ہے تو عموماً دعویٰ کرتا ہے کہ وہ جمہوریت اور آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے، اس ہولناک نسل کشی کے خلاف اقدام کر رہا ہے جس کا ارتکاب اس کے دشمن کر رہے ہیں۔ لیکن بلاشبہ مداخلت کی وجہ یہ نہیں ہیں بلکہ یہ وہ نعرے ہیں جو جنگ میں عام لوگوں کو فروخت کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جنہیں جنگ لڑنی ہوتی ہے یا اس کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اور جو سوچتے ہیں کہ وہ نیک مقاصد کی خاطر اپنی جان دے رہے ہیں نہ کہ کچھ موٹے تازے کاروباریوں اور کام چور سیاستدانوں کے ڈھیر

سارے گھٹیا قسم کے ذاتی مفادات کے لئے کوئی وجہ نہیں کہ مغرب صرف اس لئے مداخلت کرے کہ سربیا ایک مطلق العنان ریاست ہے جو کہ لوگوں کے قتل عام میں مصروف ہے۔ مداخلت کی ایک مضبوط وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر قتل کئے جانے والے لوگوں کا کوئی خصوصی قریبی تعلق مغربی ممالک سے بنتا ہو مثلاً برطانیہ اس صورت میں فوری مداخلت کرے گا کہ برطانوی باشندوں کو بوسنیا جیسا قتل عام کیا جائے۔ مثال کے طور پر برطانوی دستے فوراً افریقی ممالک میں داخل ہو جاتے۔ اگر وہاں سیاہ یہودیوں کا قتل ہو رہا ہو تو مغرب مداخلت کرتا کیوں کہ مغرب ہی یہودیوں کا سب سے بڑا ہمدرد ہے اور وہاں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ یہودیوں کا قتل ایک ایسی چیز ہے جسے ایک آن کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ بوسنیا کے مسلمان بلاشبہ نہ تو سفید فام ہیں اور نہ ہی یہودی اور نہ ہی ان عظیم طاقتوں کے اندر کوئی ایسا گروہ موجود ہے جو کہ مداخلت کے لئے دباؤ ڈالتا کہ بوسنیا کی محفوظ ہو جاتے اور نہ ہی ان کے پاس اتنا اثر و رسوخ ہے کہ وہ حکومت کو کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ کر لیتے۔ بلاشبہ برطانیہ، امریکہ، فرانس، جرمنی میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان رہ رہے ہیں لیکن ان کا ان ممالک کی سیاست پر کسی قسم کا کوئی اثر و رسوخ نہیں۔

بلاشبہ مغربی ممالک میں بوسنیا کے حوالے سے انسانی بنیادوں پر کافی زیادہ عمومی ہمدردی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب بوسنیا میں انسانی ہمدردی کے مشن کے تحت امداد کر رہا ہے اور چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ وہ کتنا رحم دل ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ خوراک اور ادویات کی فراہمی اور چند پناہ گزینوں کی مدد کوئی اقدام نہیں۔ یہ ایسا اقدام ہے جو وہ کچھ کرنے کے بجائے کرتے ہیں۔



اگر وہ انسانی بنیادوں پر امداد نہ کرتے تو انہیں ایسا کچھ کرنا پڑتا جسے فی الحقیقت امداد کا نام دیا جاتا لیکن ان کے پاس ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لہذا انہوں نے محض انسانی بنیادوں پر امداد بھیجی۔ ان کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو کھڑا دیکھ رہا ہے کہ کب ایک عورت قتل کی جاتی ہے اور کب کوئی مدد کے لئے یا ایسولنس کو فون کرنے کے لئے یا پھر تابوت برداروں کو بلانے کے لئے کہتا ہے۔ انسان دوستی کا نظریہ مداخلت کی کوئی وجہ نہیں۔

تب مغرب نے اس لئے مداخلت سے انکار کیا تھا کہ کوئی بھی شخص اس قابل نہیں تھا کہ کوئی ایسی حقیقت پسندانہ دلیل پیش کرتا کہ انہیں ایسا کیوں کرنا چاہئے تھا۔ بلاشبہ مغرب نے مداخلت میں ناکامی کی قیمت ادا کی ہے۔ مسلم دنیا میں مغرب کے خلاف اس کے رویے پر دلی نفرت پائی جاتی ہے۔ مغرب نواز مسلم سیاستداں اس وقت انتہائی مضحکہ خیز دکھائی دیتے ہیں جب ان کے مغربی دوست بوسنیا کے حوالے سے ان کی کوئی مدد نہیں کرتے۔

مغرب بھی غیر موثر اور کمزور دکھائی دیتا ہے اور وہ کافی حد تک اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ بہت سارے لوگ نیٹو کو زیادہ دیر تک سنجیدگی سے نہیں لیں گے۔ مستقبل کی جنگوں میں ہو سکتا ہے مغرب کو یہ دیکھنا پڑے کہ شہری جنگ کی حمایت نہ کریں کیونکہ جب وہ دیکھ لیں گے کہ بوسنیا کے معاملے میں مغرب زراکلیت پسند ہے۔ کیا کوئی شخص فی الحقیقت یہ مان لے گا کہ مغرب کویت میں لوگوں کو آدم خور صدام سے بچانے کے لئے گیا تھا؟ کیا کوئی شخص واقعتاً یقین کرے گا کہ اس کے بیڑے آزادی اور حقوق انسانی کی خاطر لڑ رہے ہیں جبکہ وہ دیکھ چکے ہیں کہ مغرب بوسنیا میں آزادی اور حقوق انسانی کے بارے میں فی الحقیقت کیا سوچتا ہے؟

اس بات کی کئی جہہ ہیں کہ مغرب کیوں کف افسوس ملے، دریں صورت کہ وہ بوسنیا میں کچھ کرنے میں ناکام ہو جائے۔ لیکن یقیناً انہیں اب تک اس پر کوئی افسوس نہیں۔ بوسنیا کے معاملے میں امریکہ کا کردار بہترین ہے۔ امریکہ نے بوسنیا کے لئے دوسری کسی بھی طاقت سے زیادہ کیا ہے۔ برطانیہ کا کردار سب سے برا ہے۔ ایک شخص جس پر بوسنیائی مظالم کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے برطانوی وزیر خارجہ ڈگلس ہرڈ (Douglas Hurd) ہے جس نے معدوم جان میجر کوناک کی سیدھ چلایا اور ہر ایسی کوشش جو کچھ کرنے کے حوالے سے تھی کا توڑ کرنے کے لئے وہ کچھ کیا جو کہ ممکن ہو سکتا تھا۔ اگر ہم اس بات پر نظر ڈالیں کہ امریکہ کیوں سب سے بہترین کر سامنے آیا تو ہم بوسنیا کے مرکزی خیال کو سمجھ لیں گے۔

جونہی سترہویں اور اٹھارویں صدی میں یورپ دنیا کو فتح کرنے لئے اٹھا تو یورپ میں نئی ریاست کا ارتقا ہوا یورپ ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جن میں سے ہر ایک کا اپنا قانون تھا اور ہر ریاست اپنے قانون کو ہر چیز سے اعلیٰ تصور کرتی تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتی تھی کہ دوسری ریاستوں کو اپنے برابر کا درجہ دے دیتی انیسویں اور بیسویں صدی میں جب یورپ نے پوری دنیا پر قبضہ کر لیا تو پوری دنیا اقتدار اعلیٰ کی حامل ریاستوں سے بھر گئی اور دنیا ریاستوں کے عالمی نظام کی صورت اختیار کر گئی۔

آج کل ہم ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں ریاستی نظام رائج ہے، دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں جس کی حکومت پوری دنیا پر ہو۔ یہاں صرف ریاستیں ہیں کچھ دوسروں سے زیادہ طاقتور نہیں جس کی حکومت پوری دنیا پر ہو۔ یہاں صرف ریاستیں ہیں کچھ دوسروں سے زیادہ طاقتور ریاستیں۔ قانون بین الاقوامی موجود



۱۱۶ ہے۔ عالمی بھائی چارے اور انسان دوستی کا نظریہ موجود ہے۔ لیکن ان قوانین اور اعلیٰ نظریات کو نافذ کرنے کے لئے کوئی عالمی پولیس فورس نہیں ہے۔ ان کی صرف اس حد تک پابندی کی جاتی ہے جس حد تک وہ ریاست کے لئے موزوں ہوں یا دوسری ریاستوں کو اس کی پابندی پر مجبور کر سکے۔

جو چیز پوری دنیا پر حکومت کرتی ہے وہ ان طاقتور ریاستوں کا ذاتی مفاد ہے۔ ذاتی مفادات کے نظریے پر قائم ان طاقتور ریاستوں کو انسانیت کے مصائب سے ہرگز دلچسپی نہیں بلکہ انہیں صرف اپنے ذاتی ٹھوس اور مادی مفادات سے دلچسپی ہے یا پھر اقتدار اور سیاست کی حقیقتوں سے دلچسپی ہے۔

یہ عالمی ریاستی نظام اپنا روپ بدل رہا ہے، کوئی اچھی یا نیک چیز اس ریاستی نظام کے ذریعے کبھی حاصل نہیں جاسکتی۔ اٹھارویں صدی میں جب یہ نظام نمودار ہوا تھا اسی وقت سے چہرے بدل رہا ہے۔ امریکی انقلاب کے بانی جنہوں نے ۱۷۷۶ء میں متحدہ ریاستہائے امریکہ کی بنیاد رکھی۔ وہ اس نظریے سے متعلق ہو گئے اور اس خوفناک ریاستی نظام کے خلاف دفاع کیا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آزادی اور انسانی عظمت کو دنیا پر حکمرانی کرنی چاہئے۔

اب بوسنیا میں امریکی کردار امریکی نظریات سے معمولی انحراف ظاہر کرتا ہے کیوں کہ جب انہوں نے امریکی انقلاب برپا کیا تو انہوں نے اس ریاستی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کا عزم کیا تھا۔

ریاستوں کے عالمی نظام میں طاقتوروں اور خود غرض ریاستوں کی دنیا پر حکومت ہوتی ہے۔ یہ خوفناک مصائب جو بوسنیا میں ڈھائے گئے صرف اس وجہ سے وقوع پذیر ہوئے کہ مغرب اتنا زیادہ خود غرض تھا کہ وہ انسانیت کو مصائب

۱۱۷ سے بچانے کے لئے کچھ کرنے پر آمادہ نہیں تھا یہاں تک کہ امریکہ نے بھی محض چند ہی بار واویلا کیا۔

بوسنیا کا مرکزی سبق یہ ہے کہ ریاستوں کا عالمی نظام جس طور پر اب موجود ہے مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تو پھر مسلمان عالمی ریاستی نظام کے حوالے سے کیا کر سکتے ہیں؟ انہیں کیا سبق بہر طور سیکھنا چاہئے؟

اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ عالمی ریاستی نظام بدلنے والا ہے، یہ ایک دھوکہ ہے کہ انسان دوستی کا نظریہ دنیا پر حکومت کر رہا ہے، یہ سارا نظام اقوام متحدہ کا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اقوام متحدہ اگر اتنی زیادہ مضبوط ہو جائے کہ خود غرض ریاستوں کی بجائے دنیا پر اس کا غلبہ ہو تو پھر بوسنیا جیسے مسائل معرض وجود میں نہیں آئیں گے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ بوسنیا اقوام متحدہ کی کافی زیادہ مدد کے باوجود کہ طاقتور بن جائے فی الحقیقت تباہ ہوا ہے اور انسان دوستی کا کھوکھلا نعرہ اس طرح بے نقاب ہوا ہے کہ دیکھنا جا شرماتا جا۔

اصل سبق جو کہ مسلمانوں کو بہر طور سیکھنا چاہئے یہ ہے کہ انہیں عالمی ریاستی نظام کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے چاہئے، اس کے دو طریقہ کار ہو سکتے ہیں۔ اولاً ایک تو قوم مسلم ملک کو بہر حال اتنا زیادہ طاقتور ہونا چاہئے جتنا کہ برطانیہ، فرانس، جرمنی، امریکہ اور اسی طرح کے دوسرے ملک ہیں تاکہ ہر جگہ مسلمانوں کی مدد کو آ سکے جیسے کہ امریکہ یہودیوں کی مدد کو آتا ہے یا پھر برطانیہ سفید فاموں کی مدد کو آتا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔

ثانیاً بڑی طاقتوں کے اندر موجود مسلمانوں کو اپنے معاملات اس طرح منظم کرنے چاہئے کہ وہ دوسرے لوگوں کی خاطر اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر سکیں



جیسے بوسنیا ایسے مسلمانوں کی خاطر بالکل اس طرح جس طرح یہودی اسرائیل کے لئے اثر و رسوخ استعمال کرتے ہیں۔

عالمی ریاستی نظام کو استعمال کرنے کے لئے ہم جتنی جلد یہ دونوں طریقے اختیار کریں گے ہمیں بوسنیا کی اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ آج کی دنیا میں یہ مسلم سیاست کی مکمل بے بسی ہے۔ مسلم ممالک کی درجنوں کے حساب سے موجود حکومتوں میں سے اکثر اتنی زیادہ خود غرض ہیں کہ وہ اقتدار جتھے کے ذاتی مفادات کے بارے میں ہی سوچتی ہیں۔ وہ آج بھی بوسنیا کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کر سکتی تھیں اگر وہ اتنی زیادہ خود غرض نہ ہوتیں۔ وہ بڑے آرام کے ساتھ تیل کی تمام پیداوار بند کر سکتی تھیں جس سے دنیا کی اشاک مارکیٹس اس سے بری طرح بل کر رہ جاتیں کہ فوجی دستے گھنٹوں کے اندر سراجیو میں داخل ہو جاتے۔

برطانیہ ایسے مقامات پر جس انداز میں مسلم سیاست کی جارہی ہے وہ قطعی طور پر ذلت آمیز ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی راہنما قطعی طور پر بیکار ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی کسی دوسرے فرد پر کوئی اثر و رسوخ نہیں۔ بوسنیا کے لئے سب سے بہترین کام جو یہ کر سکتے ہیں صرف اتنا ہے کہ منظر سے ہٹ جائیں۔ جونہی یہ اپنا منہ کھولتے ہیں ڈگلس ہرڈ (Douglas hurd) کا مکروہ کام اور آسان ہو جاتا ہے۔ اگر بوسنیا کے مسائل کا سبب اسلام سے نفرت ہے تو یہ سیاستداں اس نفرت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔

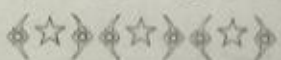
برطانیہ میں دس لاکھ مسلم دوڑ رہے ہیں لیکن تا حال وہ مسلم تعلیمی اداروں کے لئے مالی مدد حاصل نہیں کر سکے اور نہ ہی کبھی انہیں یہ بات ناگوار گزری ہے۔ حکومت بوسنیائی مدد نہیں کرتی اور مسلم سیاستداں دونوں جدت پسندانہ نظریات اور بنیاد

پرستی کے ساتھ سختی سے جڑے ہوئے ہیں۔ غریب بوسنیائیوں کو اس وقت اپنا دفاع کرنا پڑتا ہے جب ان کا تذکرہ ایران، سوڈان اور سعودی عرب ایسی حکومتوں کے ساتھ مشابہت کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ درحقیقت اگر سراجیو کی حکومت کے بارے میں یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ واقعتاً برطانوی اور فرانسیسی نظریات سے راہنمائی حاصل کر رہے ہیں تو پھر ان ملکوں کے فوجی دستے سر یوں کی مدد کے لئے فوراً داخل ہو جاتے۔

لہذا ہم سب الزام تراشی کر رہے ہیں، گمراہ لوگ بڑے ویلن کا کردار ادا کر رہے ہیں لیکن ہم نے واقعتاً موثر اسلامی سیاست کے قیام کے لئے کچھ نہیں کیا۔ پس بوسنیا کا سبق عام فہم ہے۔ ہمیں بہر طور اپنی سیاست کی بنیاد قدیم اسلام پر رکھنی ہوگی۔ ایسی سیاست ہی ایک عظیم طاقت کو جنم دے سکتی ہے جس کا راہنما قدیم اسلام کا پیروکار ہو۔ ایسی ہی عظیم طاقت جیسی کہ سلطنت عثمانیہ کی کبھی تھی۔ یہ امر برطانیہ ایسے کسی بھی ملک جیسی مقامی سیاست پیدا کر سکتا ہے جو کہ ضرورت مند مسلمانوں کے لئے خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہیں دنیا میں خجالت کا باعث نہ ہو۔

ہم اس کام کا آغاز پیارے پیغمبر ﷺ کے ساتھ کلی محبت اور خود سپردگی سے کر سکتے ہیں اور ہمیں لازماً بوسنیا میں مقیم اپنے بھائیوں اور بہنوں کے لئے دعا کرنی چاہئے۔

(وہ بات سردیوں پر نینٹو کی بمباری سے پہلے لکھی گئی تھی)





468624.  
Fax : 474627

نبیرہ اعلیٰ حضرت (سبحانہ)

محمد سبحان رضا خان

رضا انور علی سہوڈا گران سجادہ نشین و متولی

بریلی شریف فائزہ عالیہ قادریہ رضویہ

محبت گرامی قدر الحاج محمد الیاس کشمیری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا سلام اور خیریت ڈاکٹر عبدالنعم عزیز صاحب سے ملی۔

یقیناً آپ کی ”رضا اکیڈمی“ تبلیغ و اشاعت کا اہم فریضہ انجام دے رہی ہے۔ آپ کام کرتے رہتے مخالفین و حاسدین خود ہی خائب و خاسر ہو جائیں گے۔

رب کائنات آپ سے اور بھی زیادہ دینی و اشاعتی کام لے اور آپ کو و آپ کے رفقاء اور معاونین کو شاد و آباد رکھے۔ آمین۔

والسلام

دعا گو

محمد سبحان رضا خاں قادری رضوی



# اسلامی ریاست کا تصور

## Islamic concept of states

موجودہ مسلم ریاستی تصور دراصل مغرب کی نقالی ہے جو اسلامی تصور ریاست سے یکسر جدا گانہ ہے اور اسی نے پوری دنیا میں اسلام کی امیج کو خراب کر رکھا ہے اور مسلمان ہر مقام پر شکست و ریخت سے دوچار ہیں۔

پوری دنیا میں پچاس سے زائد مسلم ممالک ہیں لیکن مسلمان خود اپنی ریاستوں میں ظلم و تشدد اور افلاس و غربت کے شکار ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے مسلم ریاستوں کے حکمرانوں کی خود غرضی اور افسران کے کرپشن کا۔ پوری دنیا میں کسی ایسی عظیم الشان ریاست کا فقدان ہے جو بربریت اور اہل مغرب اور امرائیلی دہشت گردی کو روک سکے۔

برطانوی نو مسلم پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون صاحب مرحوم نے ”اسلامی تصور ریاست“ کو بہت ہی واضح طریقہ سے پیش کیا ہے۔ موجودہ مسلم ریاستیں اسلام سے قطعاً اجنبی ہیں اور مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا یہی سبب ہے۔ ضرورت ہے کہ بے غرض حکومت کا قیام ہو اور علماء اور عامۃ المسلمین ان ریاستوں کے پیدا کردہ مسائل کا حل تلاش کریں۔ نظام مصطفیٰ کے قیام کے بغیر کوئی بھی مسلم ملک باوقار مقام حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ اسلام کا حقیقی مرکز امت ہے اور اسلام میں سیاسی اختیارات کی ضرورت امت کی بحالی اور غلبہ اسلام ہے۔

علماء کو اپنا کردار بحال کرنا چاہئے اور موجودہ مسلم ریاستی نظام کو شریعت میں اتارنا چاہئے۔

امام احمد رضا نے اپنی تصنیف ”تدبیر فلاح و صلاح و نجات“ میں جو نکات پیش فرمائے ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ اللہ واحد کی حاکمیت ہی اسلامی ریاست کا حقیقی تصور ہے۔ اتباع رسول کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر مسلمان کسی بھی شعبہ حیات میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

- ڈاکٹر عبدالنعیم عریزی

## Raza Academy International

138, Northgate Road, Edgeley, Stockport SK3 9NL (England)  
Tel. 0161-4771 595, Tele/Fax 0161-2911 390, E-mail : islamictimes@aol.com